وہ عجیب ماں تھی۔ اپنی ہی اولاد سے ایسا سلوک....

اُمِ طیفور کے قلم سے نکلی ایک چشم کشا تحریر

ناولٹ

اونچ نیچ کا پہاڑ

یسرا حصہ

اکبر صاحب نے دفتر سے تین دن کی چھٹی لی تھی اور ان تین دنوں میں انہوں نے زین سے قریب ہونے کی سر توڑ کوشش کر لی تھی لیکن جو خول اس کے اوپر چڑھ چکا تھا اسے تڑخانا بہت مشکل تھا۔ بیوی کے ساتھ ان کی سارا وقت ناراضی رہی تھی۔ کمرے سے بھی دونوں کے چیخنے بولنے کی آواز آتی۔ زویا تو سہم جاتی لیکن خضر جارحیت کا مظاہرہ کرتا۔ وہ باپ کے زین کی حمایت میں نکلنے والے لفظ، لفظ کو زہر کی طرح پیتا رہا اور یہی زہر وہ باپ کے جانے کے بعد زین پر انڈیلنے والا تھا۔ وہ بھی کیا کرتا، اس نے کب بھلا کم لینا، کم پر شکر کرنا سیکھا تھا۔ اسے ہمیشہ اولیت ملی تھی اور سب کچھ اولین ملا تھا۔ اولاد میں توازن آنے والی پوری نسل کا توازن

www.dailyurdubooks.com

ہوتا ہے۔ یہ ایک فرد کی خرابی نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات موجودہ اور مستقبل میں وابستہ ہونے والے افراد تک یہ خرابی جاتی ہے۔ پیمانے میں اگر زہر بھرا جائے تو وہ پینے والے کو زہر ہی بن کر لگے گا، تریاق نہیں۔

اکبر صاحب مایوس سے واپس جا چکے تھے۔ زین کو اس سے فرق نہیں پڑا تھا کہ وہ اس کی خاطر امی سے بھڑتے رہے کیونکہ امی کا یا خضر کا رویہ ان کے لیے نیا تو نہیں تھا۔ وہ اب سے نہیں ابتدا سے جانتے تھے کہ گھر میں زین کی حیثیت کیا ہے اور ہر کوئی اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔

اصل فرق تو یہ پڑا تھا کہ پہلے انہیں سعدیہ کی طرح خضر سے ہی توقعات وابستہ تھیں مگر جوں جوں وقت گزرا، خضر پڑھائی میں تو کوئی کارنامہ سرانجام نہ دے سکا اور دیگر سرگرمیوں کی بنا پر بدنامی کا سبب بھی بنا تو اکبر صاحب کو اپنے چھوٹے بیٹے کی خوبیوں کا ادراک ہوا تھا۔ اس کا ایک مخصوص ڈگر پر چلتا تعلیمی ریکارڈ، اسکول اور محلے میں اچھی شہرت نے ان کی توجہ کچھ عرصے سے اپنی جانب مبذول کروا لی تھی۔ باپ تھے، حق رکھتے تھے، حق جتانے کا۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ جب ماں باپ بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑے ہونے والے ہوں تو وہ مستقبل کے لیے اپنی کوئی ایک اولاد چن لیتے ہیں جس پر وہ انحصار کرنے لگتے ہیں۔ اکبر صاحب کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ زین میں انہیں وہ تمام خوبیاں دکھائی دی تھیں جو وہ خضر میں دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ اوپر سے اس کے ساتھ ہوئے حادثے نے انہیں اس کے درد کی جڑ سے آشنا کر دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ سعدیہ بھی اب اس بات کو سمجھیں کہ ان کی بے پروائی نے زین کے اندر کیسی محرومیاں بو دی ہیں۔ وہ گھر میں ایسے رہتا ہے جیسے یہ اس کا عارضی ٹھکانا ہو۔ محدود ضروریات، محدود احتیاجات۔ کوئی مانگ نہ کوئی طلب۔

☆☆☆

اکبر صاحب کے جانے کے بعد گھر میں سعدیہ کا رویہ زین کے ساتھ اکھڑا، اکھڑا سا تھا۔ وہ اس کا خیال رکھ رہی تھیں۔ اکبر صاحب نے باقاعدگی سے اسے یخنی پلانے کا کہا تھا اور وہ خود بھی ناغہ نہیں کر رہی تھیں لیکن اس سے بات چیت بند کر رکھی تھی۔ زین کو ماں کی ناراضی کی پروا ہوتی تھی کیونکہ دادی نے ایک بات اسے گھول کر پلا دی تھی کہ ماں، باپ کی ناراضی رب کی ناراضی ہے اور وہ ڈرتا تھا۔ اللہ سے، اس کی ناراضی سے۔ سعدیہ جب کمرے میں اسے دودھ کا گلاس دینے آئیں تو مڑنے پر زین نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"امی ناراض ہیں۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے کیا؟"

"نہیں بیٹا۔ غلطی تو مجھ سے ہوئی ہے، ہر بات کے لیے قصوروار میں ہی تو ہوں۔"

زین نے ماں کو پاس بٹھا لیا۔ سعدیہ ناچاہ بیٹھ تو گئیں پر چہرہ پھیرے بستر کی چادر کی سلوٹیں درست کرتی رہیں۔ زین کو ماں کی اس حرکت پر پیار آ گیا۔ وہ ماں کے ہاتھ کی پشت سہلاتے ہوئے رسانیت سے بولا۔

"امی، کیا بات ہے۔ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں آپ۔ دیکھیں مجھے نہیں پتا کہ آپ کی اور ابو کی کیا بات ہوئی ہے لیکن جو بھی ہوئی ہے اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ آپ مجھ سے کیوں ناراض ہو رہی ہیں؟"

"مجھے ایک بات بتاؤ زین۔ کب میں نے تمہاری ذمے داریوں سے منہ موڑا ہے۔ کب تمہارا خیال نہیں کیا۔ کب تمہیں وقت پر ناشتا، کھانا نہیں دیا جو تم نے اپنے باپ کو مظلوم بن کر دکھا دیا اور مجھے برا بنا دیا۔ تمہیں کرنٹ لگا تو کیا لگتا ہے میں تکلیف میں نہیں تھی کیا..... تھی۔ بالکل تھی لیکن تمہارے باپ کو تمہارے کس رویے نے یہ احساس دلا دیا کہ مجھے کوئی فرق ہی نہیں تھا پڑا۔ ہم..... م..... بولو۔" سعدیہ نیم جارحانہ انداز میں اس سے باز پرس کر رہی تھیں اور وہ گم صم سا سن رہا تھا۔ کچھ پل اس نے الفاظ جمع کرنے میں لیے اور تھوک نگل کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔

"میں ایسا احساس کیوں دلاؤں گا امی۔ آپ مجھ سے بدگمان ہونا کب چھوڑیں گی۔ میری ماں ہیں لیکن مجھے سمجھتی ہی نہیں آپ۔ کیا بچپن سے لے کر اب تک کبھی بھی میں نے آپ کی شکایت ابو سے کی ہے جواب کرتا۔"

"تم منہ سے کچھ نہیں کہتے زین لیکن تمہاری حرکتیں سب واضح کر دیتی ہیں۔ تمہیں کبھی کہنے کی نوبت

www.dailyurdubooks.com
URDU BOOKS DAILY

ہی نہیں آتی، بنا کہے ہی ہر کام ہو جاتا ہے تمہارا۔"

"کون سا کام ہو جاتا ہے میرا۔ مجھے بھی تو پتا چلے۔ میں نے کبھی خضر کی طرح ضدیں منوائی ہیں کیا۔ کبھی حیثیت سے بڑھ کر مانگ کی ہے کیا؟" وہ بے اختیار شکوہ کر گیا تھا حالانکہ دانستہ یہ کام وہ چھوڑ چکا تھا۔

"خضر.....خضر.....خضر۔" سعدیہ چلّا اٹھیں۔

"آخر کب تک تم بڑے بھائی کے خلاف دل میں زہر پالتے رہو گے زین۔ کب تک .....وہ تمہاری نفرت سہتے، سہتے نیلا ہو چکا ہے۔ تمہارے اندر کی منفیت نے اس پر ایسا اثر ڈالا ہے کہ نہ وہ پڑھائی میں کارگردگی دکھا پا رہا ہے نہ گھر میں حاضر دماغ رہتا ہے۔ بڑی کوشش کی تھی میں نے کہ میں اس کے اندر مایوسی اور محرومی نہ پلنے دوں لیکن نہیں۔ وہ میرے جیسی قسمت لے کر پیدا ہوا ہے۔ جس طرح میری حق تلفی میرے بہن بھائی کرتے رہے، ویسے ہی اس کی حق تلفی تم کرتے آئے ہو اور آئندہ بھی کرتے رہو گے کیونکہ تم چاہتے ہی نہیں کہ وہ کسی کی نظروں میں ابھر سکے۔ پر ایک بات یاد رکھنا زین جیسے تم میرے بیٹے ہو ناں ویسے ہی وہ بھی ہے اگر میں تمہیں نظر انداز نہیں کر سکتی تو اسے بھی کبھی نہیں کروں گی۔ میں کبھی اس سے محبت کرنا نہیں چھوڑ سکتی چاہے سب لاکھ روڑے اٹکائیں۔ اس گھر میں اس کی جگہ اور حیثیت کو میں کسی کو بھی چیلنج کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ سمجھ لو اچھے سے۔" سعدیہ اس کے سامنے انگلی لہرا، لہرا کے بولتی اسے حیران پریشان چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا اس کے سامنے اس کی ماں نہیں "شریکا" بول کر گیا ہے۔ ایسے کوئی اپنی اولاد سے تو نہیں لڑتا بلکہ اپنی اولاد کے لیے شریکوں سے ضرور لڑ پڑتا ہے۔

وہ جانتا تھا کہ خضر اس کی ماں کی لائف لائن ہے لیکن پھر بھی وہ اندر تک دکھی ہو گیا تھا۔ کیا تھا جو وہ منہ سے اتنے سخت جملے نہ کہتیں۔ بھلا وہ کب بے خبر تھا لیکن کہنے اور خاموش سہنے کا فرق نہ مٹتا۔ جب وہ اس کھلے امتیاز کو تسلیم کر چکا تھا تو ہر بار جتا کے اس کی زندگی میں مزید اذیت رقم کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ آنسو پیتا بے دھیانی میں اپنا انک پین دودھ کے گلاس میں گھما رہا تھا۔ شفاف سفید دودھ میں نیلاہٹ گھلنے لگی تھی بالکل اس کے وجود کی طرح۔

☆☆☆

وہ کلاس کی آخری بینچ پر بیٹھا اپنا کام کر رہا تھا جب پرنسپل کسی کے ساتھ کلاس میں داخل ہوئے۔ پوری کلاس یک دم استقبال کے لیے کھڑی ہوئی اور حسب پروٹوکول "السلام علیکم سر" کی آواز پوری کلاس میں گونجی۔ پرنسپل نے سر کے اشارے سے بیٹھنے کا کہا اور اپنے ساتھ آئے لڑکے کا تعارف کرانے لگے۔ زین کو وہ لڑکا دیکھا، دیکھا سا لگا۔ وہ اسے بغور دیکھتا پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پرنسپل کلاس میں موجود ٹیچر سے گفتگو کر رہے تھے اور وہ لڑکا سیدھا چلتا ہوا خضر کے ساتھ والی سیٹ پر جا بیٹھا۔ دونوں نے جوش سے اپنے، اپنے ہاتھ کے مکے بنا کے ایک دوسرے سے ٹکرائے اور ساتھ ہی زین کو بھی یاد آ گیا کہ وہ کون تھا۔ خضر کا ایکس کلاس فیلو ارحم جس کی شہرت کبھی بھی اچھی نہیں تھی۔ اس کی صحبت نے ہی خضر کا بھی ستیاناس کیا تھا۔ نہ پڑھنے والے بچوں میں شمار ہوتا تھا۔ عمر بھی زیادہ تھی۔ اگر تمیز سے پڑھ رہا ہوتا تو سیکنڈ ائیر میں ہوتا۔ اب اس اسکول میں اور اسی کلاس میں آنے کا مقصد یقیناً خضر ہی تھا۔ زین نے تنفر سے ان دونوں کی پشت کو دیکھا اور وہ دل میں حقیقتاً خضر کے لیے فکر مند بھی ہوا۔ یہی وہ لڑکا تھا جس نے خضر کو لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کی عادت میں مبتلا کیا تھا۔ ایک آدھ بار وہ اس سے مل چکا تھا لیکن سرسری سا۔ وہ خود دوستی کے معاملے میں بہت احتیاط پسند تھا۔ اگر اس کا کوئی دوست بنتا نہیں تھا تو وہ خود بھی بنانے میں پہل نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ آج کل کے لڑکوں میں پائی جانے والی اخلاقی برائیوں سے ناواقف نہیں تھا۔ ایسی باتوں سے وہ خار کھاتا تھا۔ لیکن اس کی قسمت تھی کہ جب، جب وہ جس بات سے خار کھاتا تھا وہ حادثہ بن کے اس سے ٹکرا جاتی تھی۔

☆☆☆

توقیر چاچو کے گھر سب کی دعوت تھی۔ انہوں

www.dailyurdubooks.com
URDU BOOKS

نے نیا گھر بنایا تھا۔ اب تک اس کے سب چاچو ایک ساتھ رہتے تھے لیکن دادی کے انتقال کے بعد سبھی باری، باری الگ ہو گئے اور تو قیر چاچو بھی کرایے پر چلے گئے۔ آبائی گھر بیچ کے انہیں جو حصہ ملا تھا اس سے گھر خریدنے کے بجائے کاروبار کو وسعت دی تھی اور اب کام اچھا چل نکلا تھا تو انہوں نے گھر بھی بنوا لیا۔ اکبر صاحب شروع سے بھائی کی دانشمندی کے قائل تھے، وہ بھی چاہتے تھے کہ اپنے حصے سے کاروبار کر لیں لیکن سعدیہ کی ضد کے باعث کافی رقم گھر پر اٹھ گئی تھی اس لیے کاروبار کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔ ورنہ وہ جاب کی ایک لگی بندھی روٹین سے اکتا گئے تھے۔ بچوں اور گھر سے دوری نے انہیں بیزار کر دیا تھا۔ تو قیر کے لیے وہ بہت خوش تھے اور بچوں سمیت ان کے گھر پر مدعو تھے۔ سعدیہ کی اپنی سسرال سے خاص بنتی نہیں تھی اس لیے ہمیشہ کی طرح لیے دیے انداز میں وہ بھی محفل کا حصہ تھیں۔

زین کا یہاں بہت دل لگتا تھا۔ تو قیر چاچو کے ہاں اولاد بہت دیر سے ہوئی تھی اس لیے ان کے تینوں بچے کافی چھوٹے تھے۔ ان تینوں کا فیورٹ کزن زین تھا۔ زین ان کے ساتھ چھت پر خوب کھیلتا تھا۔ اس وقت بھی وہ چھت پر ''اونچ نیچ کا پہاڑ'' کھیل رہا تھا۔ وہی اس کا من پسند کھیل جو وہ اپنے بچپن میں کبھی کھل کر کھیل نہیں پایا تھا۔ کبھی کسی نے کھلایا نہیں تو کبھی کھیلنے کے لیے ساتھی نہ ملے اور اب اپنے تین چھوٹے، چھوٹے کزنز کے ساتھ وہ کبھی اونچائی پر چڑھتا تو کبھی نیچائی پر اترتا خوب ہنس رہا تھا۔

''اونچ نیچ کا پہاڑ
سچے موتیوں کا ہار
مالک دیکھ رہا ہے
کتا بھونک رہا ہے
دیکھتے ہیں سب سے
پہلے کون پکتا ہے''

زین ایک اونچی ٹوٹی ہوئی کرسی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ بچے ہنستے چیختے خوب شور مچا رہے تھے۔ تبھی خضر چھت کا دروازہ کھول کر انہیں تضحیک آمیز نگاہوں سے دیکھتا آتا دکھائی دیا۔ زین کے اندر بے چینی نے سر ابھارا۔ وہ یقیناً کھیل خراب کرنے آیا تھا۔

''تم ناں ڈنگر کے ڈنگر ہی رہنا۔ کبھی کوئی مردوں والا کھیل بھی کھیل لو یا مرد بننا پسند ہی نہیں تمہیں۔'' وہ جاہلوں کی طرح ببل چبا رہا تھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالتا زین کے قریب آ کر بولا۔ تینوں بچے بھی کھیل روک کے زین کے پاس آ گئے تھے۔ وہ خضر کو پسند نہیں کرتے تھے۔

''تم ہو ناں مرد۔ تم ہی رہو۔ مجھے بچہ ہی رہنے دو۔ اور پلیز بچوں کے سامنے تمیز سے بات کرو یا پھر جاؤ یہاں سے۔''

زین کا ایسا کہنا قیامت ہو گیا۔ خضر نے اسے کالر سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔

''واہ بھئی واہ۔ کتا بھونک رہا ہے۔ منہ توڑ دوں گا جو منہ لگے تو۔ اور فکر نہ کرو اب بچے نہیں رہو گے۔ ارحم نے تمہیں بڑا بنانے کا شاندار پلان بنایا ہے۔ ہا... ہا... ہا۔'' وہ ہنسا تھا، بہت بھدا۔ زین نے اسے ناسمجھی سے دیکھتے ہوئے کالر چھڑایا اور پوچھا۔

''کھل کر بات کیا کرو خضر۔ مجھے پہیلیاں نہیں آتیں۔ اور ارحم جیسے لڑکے کا تذکرہ بھی میں پسند نہیں کرتا۔ جیسا وہ خود ہے ویسی ہی اس کی گھٹیا باتیں اور عادتیں ہیں، سمجھے۔''

''میرا دوست ہے وہ۔ یار ہے میرا وہ۔ منحوس۔''

خضر نے اس کے منہ پر غصے سے مکا جڑ دیا تھا۔ زین کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا اور خون رسنے لگا۔ تینوں بچے خون دیکھ کر رونے لگے تھے۔ اس سے پہلے آوازیں سنتا کوئی اوپر آ کر خبر لیتا، خضر خود ہی اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتا اسے غصے سے دیکھتا ہوا نیچے چلا گیا تھا۔ زین نے اپنا منہ صاف کر کے تینوں کو بہلا کے کھیل شروع کر دیا تھا لیکن وہ دل میں فکرمند ضرور ہو گیا تھا۔ ارحم جیسے لڑکے سے اچھی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

☆☆☆

وہ مضمحل سا بریک ٹائم میں کینٹین کی بیک سائڈ پر بیٹھا تھا۔ پیپرز قریب تھے اس لیے آج کل کلاس کے

www.dailyurdubooks.com
URDU Books DAILY ®

کئی پڑھا کو بچے اس کے ساتھ وقت گزارنے کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ بھلے سے ٹاپرز میں شمار نہیں ہوتا تھا لیکن اس کی پڑھنے کی لگن، اس کے پرفیکٹ نوٹس سب کو اس کی جانب متوجہ کر لیتے تھے۔ اس وقت وہ عبداللہ کا انتظار کر رہا تھا جو کینٹین سے اپنے کھانے کے لیے کچھ لینے گیا تھا۔ وہ کئی دن سے زین سے درخواست کر رہا تھا کہ اسے مطالعہ پاکستان کے کچھ سوالوں کے جواب مارک کروا دے۔ زین کو اس طرح کی مدد کرنے میں کبھی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ وہ انہماک سے عبداللہ کی کتاب پر جھکا ہوا تھا جب اس کے قریب دھپ سے کوئی آ کر بیٹھا تھا۔ زین نے سر اٹھا کر دیکھا، وہ ارحم تھا۔ وہ چونکا بھی تھا اور سہما بھی لیکن اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ جواباً انتہائی واہیات مسکراہٹ کے ساتھ اسے گھورنے لگا۔ زین کی گردن کی پشت پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ ارحم کے دیکھنے کا انداز خاصا عامیانہ تھا۔ ناچار اسے پوچھنا پڑا تھا۔

''کیا بات ہے۔ کوئی کام ہے تمہیں۔ خضر ابھی کچھ دیر پہلے لیبارٹری والی سائڈ پر گیا ہے۔'' اسے لگا کہ وہ شاید خضر کا پوچھنے آیا ہے لیکن ارحم کے تیور اچھے نہیں تھے۔

''خضر کون ہے۔ میں نہیں جانتا۔ جب سے خضر کا بھائی دیکھ لیا ہے اس میں میرا کوئی انٹرسٹ باقی نہیں رہا۔'' وہ زین کا ہاتھ تھام کر گھٹیا انداز میں بولا اور قریب تھا کہ اسے لبوں سے لگا لیتا، زین نے ایک جھٹکے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

''کیا بکواس ہے۔ کیا چاہیے تمہیں۔ اٹھو، ابھی اٹھو یہاں سے ارحم، ورنہ میں شکایت کر دوں گا تمہاری۔ میں تمہاری ٹائپ کا لڑکا نہیں ہوں سمجھے۔ جاؤ یہاں سے۔'' زین کھڑے ہوتے ہوئے نہایت ترشی سے بولا تھا۔ ارحم کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ بھی کھڑا ہوا اور زین کی گردن پل بھر میں دبوچ کر اس کا چہرہ قریب کرتے ہوئے بولا۔

''اوئے اوقات میں رہ اپنی۔ کس ٹائپ کا ہوں میں؟ اور کس ٹائپ کا ہے تو؟ خود کو سمجھتا کیا ہے۔ چار نمبر کیا لیتا ہے کلاس میں، تیری نسل ہی بدل گئی، واہ۔''

ارحم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زین کو مارنا شروع کر دیتا۔ لیکن وہ پہلے سیدھی انگلی سے گھی نکالنا چاہتا تھا۔ اس لیے غصے پر قابو پاتے ہوئے اس کی گردن چھوڑ کر گال پر تھپکی دی اور پھر اس کے کان کی لو مسلنے لگا۔

''دیکھ زین۔ مجھے بہت پیارا لگا ہے تو..... بڑا حسین۔ یہ تیرا بھائی تو تیرے آگے کچھ نہیں۔ میرے ساتھ دوستی کر لے۔ خوب مزے کراؤں گا قسم سے۔''

خوف کی شدید لہر زین کو مفلوج کر گئی۔ وہ بالکل سُن سا ہو گیا۔ ارحم کے بات کرنے کا، دیکھنے کا انداز اس قدر عامیانہ تھا کہ اسے لمحہ بھی نہیں لگا تھا اس کا مقصد جاننے میں۔ اور ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنے کا اس نے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ سیدھے سادے لڑکے دیکھے تھے اب تک۔ اس طرح کا لڑکا پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ چند پل یونہی وہ جامد و ساکت اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا اور پھر نہ جانے کیسے ہمت جمع کر کے اسے پوری قوت سے پرے دھکیل دیا۔ ارحم بری طرح لڑکھڑایا لیکن گرنے سے بچ گیا۔ وہ سُبکی کے احساس سے مغلوب ہو کر اسے مارنے کے لیے جھپٹا تھا لیکن اسی وقت عبداللہ ایک اور لڑکے کے ساتھ ہاتھ میں کھانے پینے کا سامان لیے وہاں چلا آیا۔ ارحم کو اپنا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے کرنا پڑا۔ اسے شہادت کی انگلی لہرا کر خاموش وارننگ دیتا وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔ بعد کا سارا وقت زین نے شدید بے چینی میں گزارہ تھا۔ وہ ارحم کا مقصد سمجھ کر بھی انجان بن رہا تھا۔ خود کو سمجھا رہا تھا کہ ویسا کچھ نہیں جیسا وہ سوچ رہا ہے، بھلا ان کے اسکول میں پہلے کب کسی کی ہمت ہوئی ہے ایسی حرکت کی۔ اور پھر بھلا کوئی لڑکا کب ایسا کر سکتا ہے۔ انہی طفل تسلیوں میں اس نے چھٹی تک کا وقت گزارہ تھا۔

☆☆☆

وہ گھر آ کر بھی اس قدر ذہنی تناؤ کا شکار رہا تھا کہ پہلی بار اس نے ارادہ کیا کہ اس بارے میں وہ ابو سے بات کرے گا۔ اس کے اندر جو مسلسل کھٹک تھی وہ

www.dailyurdubooks.com
URDUBOOKS

ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔ خضر سے اس بارے میں پوچھنا عبث تھا وہ تو خود اسے ایسی معنی خیز مسکراہٹ سے تکتا تھا کہ زین کا لہو جم سا جاتا تھا۔ اکبر صاحب ویک اینڈ پر آئے ہوئے تھے اور کل کا پورا دن اس کے پاس تھا کہ وہ سکون سے اپنا مسئلہ ان سے شیئر کر پاتا۔ اسکول سے چھٹی ہونے کی وجہ سے اس کے پاس سوچنے کا کافی وقت تھا۔ لیکن وہ یہ بھول گیا تھا کہ خضر اس حد تک شاطر ہو چکا تھا کہ وہ اس سے ہمیشہ دو قدم آگے رہتا تھا۔

وہ فی الفور بھانپ گیا تھا کہ زین، ارحم کے بارے میں ابو سے بات کرنے کی کوشش کرے گا یا پھر اس کے اندر کا چور تھا جس نے اسے اس جانب سے ہوشیار کر دیا تھا۔ اور ایسا ہو جاتا تو وہ بھی باپ کے عتاب کا شکار ہو جاتا۔ اکبر صاحب پچھلے اسکول میں بھی ارحم کے ساتھ خضر کی دوستی سے نالاں تھے اور اب تو یہ بات خضر کے گلے کا طوق بن جاتی اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ ارحم اس کے پیچھے، پیچھے اس اسکول میں بھی آ گیا ہے۔ اسے زین کے بات کھول دینے سے پہلے ایسا کمال دکھانا تھا کہ وہ شکایت کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔

شام کو جب زین اپنے کمرے میں پڑھ رہا تھا تو خضر پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے پاس آیا۔ زین نے حیرت اور کھوجتی نگاہوں سے اسے دیکھا اور سر واپس کتاب پر جھکا لیا۔ وہ دل ہی دل بیزار ہوا کہ خضر بلاضرورت اس کے کمرے میں نہیں آتا تھا یا تو لڑنے آتا تھا یا پھر اس کا وقت برباد کرنے۔ لیکن اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس بار وہ زین کی ''کریڈیبلیٹی'' خراب کرنے آیا ہے۔

''کیا پڑھ رہے ہو؟'' خضر نے اس کی اسٹڈی ٹیبل کے ساتھ کمر کا نچلا حصہ ٹیکتے ہوئے پوچھا۔

''کیمسٹری۔'' مختصر جواب دیا۔

''اچھا تو پھر مجھے بائیو کی بک چاہیے تھوڑی دیر کے لیے۔''

''سر کے پاس ہے۔ کلاس میں لی تھی انہوں نے۔ پرسوں اسکول لگے گا تو واپس ملے گی۔''

''اوہو، مجھے ضروری چاہیے تھی۔ چلو فزکس اور انگلش کی دے دو پانچ، دس منٹ کے لیے۔ ابھی واپس کر جاتا ہوں، نشان لگانے ہیں بس۔''

خضر کو یقین تھا کہ وہ ابھی اٹھے گا اور جا کر خود لا کر دے گا کیونکہ اپنے بیگ کا بلاوجہ چھیڑے جانا اسے پسند نہیں تھا لیکن اسے شدید حیرت ہوئی جب اس نے صفحہ پلٹتے ہوئے کہا۔

''کپڑوں والے اسٹینڈ پر ہے بیگ۔ نکال لو۔ اور پلیز جلدی واپس دے جانا۔''

خضر نے بے ساختہ امڈنے والی اپنی خبیث مسکراہٹ پر قابو پایا اور بکس نکالنے چلا گیا۔ گو کہ اس کا پلان کچھ اور تھا لیکن زین کے بھولپن نے یا سادگی نے اسے مزید آسان کر دیا تھا۔ خضر کتابیں لیے واپس آیا تب بھی زین اسی طرح انہماک سے پڑھ رہا تھا۔ باہر نکلنے سے پہلے خضر نے اس کے سر کی پشت پر مارنے والے انداز میں کتابیں لہرائیں اور مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

شام ہوئی تو وہ یک دم نیند سے جاگا تھا۔ عصر پڑھ کر وہ یہیں اپنی ٹیبل پر سر رکھے سو گیا تھا۔ باہر مغرب کی اذانیں ہونا شروع ہوئیں تو وہ بھی جاگ گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ مغرب پڑھ کر ابو کے ساتھ ہی واک کے لیے نکل جائے گا۔ ان کی عادت تھی کہ ویک اینڈ پر جب بھی آتے تھے تو مغرب کے بعد واک کے لیے نکلتے تھے، اسی بہانے محلے داروں سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ جلدی، جلدی کتابیں سمیٹتا ریک سے اپنے بند جوتے نکال کر پہننے ہی والا تھا جب دھاڑ سے اس کا دروازہ کھلا اور اکبر صاحب اندر داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے سعدیہ اور خضر بھی تھے۔ زین استفہامیہ نگاہوں سے انہیں تکتا سیدھا ہوا۔ وہ ان تینوں کے یوں اچانک اپنے کمرے میں آنے پر حیران تھا وہ بھی اس قدر سنگین و سنجیدہ چہروں کے ساتھ۔

''کیا بات ہے ابو؟ خیریت ہے، میں آپ کے پاس ہی آ رہا تھا۔ کچھ بات کرنی تھی۔'' اس نے اچٹتی نگاہ خضر پر ڈال کر باپ سے کہا تو خضر اس کے دیکھنے سے چڑ کر اونچی آواز میں بولا۔

www.dailyurdubooks.com
URDU BOOKS

"کیوں، کیا کرنے آرہے تھے۔ اب پردے ڈالنے کا کوئی فائدہ نہیں زین۔ میں نے سب بتا دیا ہے ابو کو۔"

زین کے اعصاب یک دم ڈھیلے ہوئے۔ وہ سمجھ گیا کہ خضر نے ارحم اور اس کی ان بن کا تذکرہ کر دیا ہوگا۔ اچھا تھا اب اسے تمہید باندھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

"اچھا کیا تم نے بتا دیا۔ میں بھی کوئی پردہ نہیں ڈالنے والا تھا۔ یہ بات چھپانے والی تھی بھی نہیں۔ اور مجھے کسی کا ڈر نہیں پڑا ہوا جو چھپاؤں گا میں۔"

اس کے کہتے ہی اکبر صاحب آگے بڑھے اور زوردار تھپڑ زین کے منہ پر کھینچ مارا۔ زین ہکا بکا گال پر ہاتھ دھرے باپ کو دیکھتا رہ گیا۔ خضر نے اپنی ہنسی دبانے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھا تھا۔

"ک.....ک.....کیا ہوا ہے ابو۔ میں نے کیا، کیا ہے؟"

یہ سوال پوچھتے اسے کس وقت کا سامنا کرنا پڑا تھا وہی جانتا تھا۔ گال سے زیادہ دل فگار ہوا تھا۔ سعدیہ بھی اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھیں لیکن چپ تھیں۔

"اب بھی مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ کیا، کیا ہے میں نے۔ جس وقت خضر نے مجھے بتایا تھا، میں نہیں مانا تھا لیکن تم نے تو میرے کچھ بھی پوچھنے سے پہلے اعتراف کر لیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا زین کہ تم ایسی کسی حرکت میں پڑ سکتے ہو۔"

"ابو کیا، کیا ہے میں نے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ میں کیا سمجھا تھا اور آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کھل کر بتائیں تو سہی۔" وہ روہانسا ہوتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

اکبر صاحب اس کے اندر تک اپنی نگاہیں اتار رہے تھے۔ اسے جانچ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ نرم پڑتے، خضر نے آگے بڑھ کر اس کا بیگ اسٹینڈ سے جھپٹا اور باپ کے سامنے لا دھرا۔

"چیک کر لیں ابو۔ خود ہی دیکھ لیں۔ یہ سب کچھ یہ بریک میں کرتا ہے اور کسی ٹیچر کا اس پر بس نہیں چلتا۔"

زین نے ناسمجھی سے اپنے اسکول بیگ کو دیکھا جسے اکبر صاحب سست روی سے کھول رہے تھے جیسے

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

گرما ترین جون 2023ء

کے جاں فزا شمارے

کی ایک جھلک

شیطانی ہتھیار

مسیحاؤں کے بھیس میں درندہ صفت انسانی دشمنوں کا گھناؤنا طریقۂ واردات۔ ایک انوکھے ہتھیار سے پھیلنے والی ہلاکت خیزی کے سنسنی خیز واقعات۔ **امجد رئیس** کے قلم سے

شعلہ زن

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی دردناک داستان حیات..... **روبینہ رشید** کے قلم کی جادوگری

دبر

دنیا مجبور کرتی ہے کہ ان پر قہر بن کر ٹوٹ پڑو.... ایک ایسے ہی نوجوان کی کوچہ گردی .... زندگی اس کے لیے خالی کشکول کے مانند تھی.... **حسام بٹ** کے قلم سے نئی سلسلے وار کہانی۔

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

عزت کے لیے سب کچھ داؤ پر لگایا جا سکتا ہے.... ایک غیرت مند نوجوان کی عزت کا معاملہ

دوسرا رنگ

شکاریوں کو دھوکا دے کر بچ نکلنے والے شکار کی جدوجہد

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

www.dailyurdubooks.com

انہیں خوف ہو کہ اندر سے خضر کی بتائی ہوئی خرافات نہ نکل آئیں۔ سعدیہ آگے بڑھیں اور شوہر کے ہاتھ سے بیگ لے کر اسے کھول کر وہیں الٹ دیا۔ کتابوں کا ڈھیر باہر آیا تھا اور ساتھ ہی سگریٹ کے دو پیکٹ، لائٹر، گندی واہیات سی تصویریں جن پر نگاہ پڑتے ہی زین کی رنگت فق ہو گئی تھی۔ ایسی تصاویر تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھیں۔ ماں باپ کے سامنے اس کا دل زمین میں اتر جانے کو چاہا۔ یہ تو وہ چیزیں تھیں جن کی اسے پہچان تھی کہ یہ سب ہے کیا لیکن اس کے علاوہ جو کچھ تھا ان کے بارے میں تو اسے خبر تک نہ تھی کہ یہ کیسی ذلالتیں ہیں جو اس کے سر منڈھ دی گئی ہیں۔ وہ بھی سگے بھائی کی طرف سے۔ وہ سب کی طرح بالکل اسی انداز میں انہیں دیکھ رہا تھا جیسے پہلی بار دیکھنے والا بھرپور تجسس بھری حیرت کے ساتھ دیکھتا ہے۔ زین رکوع کی حالت میں جھک گیا اور ان چیزوں کو ہاتھ میں تھامنے لگا تھا کہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا اور پیٹھ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے ماں باپ کھڑے تھے اور اس میں مزید ہمت نہیں تھی کہ وہ ان اشیا پر ان کی موجودگی میں دوبارہ نگاہ ڈالتا۔ سعدیہ کو زین کی اس حرکت نے تاؤ دلا دیا۔ انہوں نے اسے کندھے سے جھپٹ کر رخ اپنی جانب موڑا اور بولیں۔

''منہ کیوں چھپا رہے ہو۔ یہ سب کرتے حیا مر گئی تھی کیا؟''

زین کی بند آنکھوں سے آنسو ایک تار گالوں پر بہتے چلے آئے۔ اس نے نچلا ہونٹ سختی سے دانتوں میں دبا رکھا تھا۔ بھنچی ٹھوڑی لرز رہی تھی۔ اکبر صاحب یک ٹک اسے دیکھے گئے۔ سعدیہ کا ہاتھ فضا میں اٹھا لیکن دوسرے ہی پل وہ ہاتھ اکبر صاحب کی سخت گرفت میں تھا۔

''کیوں پکڑا ہے آپ نے مجھے..... چھوڑیں۔ دیکھ نہیں رہے کہ کیا گل کھلا رہا ہے یہ لڑکا۔ بہن والا ہو کر اس قدر بے غیرت ہے۔ اس سے تو اچھا تھا یہ پیدا ہوتے ہی مر گیا ہوتا۔ آج یہ بدنامی تو نہ جھیلتے ہم..... چھوڑیں اکبر مجھے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گی آج۔''

''کوئی اسے کچھ نہیں کہے گا۔ یہ میرا حکم ہے۔ اگر کسی نے اسے کچھ کہا تو انجام کا ذمے دار وہ خود ہو گا۔ سمجھ میں آیا تم سب کو۔'' اکبر صاحب نے غصیلے لہجے میں کہہ کر بات گویا ختم کر دی۔ خضر کو چار سو وولٹ کا جھٹکا لگا باپ کی بات سن کر۔ یہ تو غیر متوقع تھا۔ اتنی محنت سے اس نے یہ سب زین کے بیگ میں ڈالا تھا اور اب بنا کسی اختتام کے فلم ہی بند ہو گئی تھی۔ اس کا منہ اتر گیا۔ باپ پر جو غصہ آیا سو آیا ماں پر اس سے بڑھ کر آیا تھا۔

''بھلا کیوں دب گئیں وہ ابو سے۔ پہلے تو کبھی نہیں دبیں۔'' وہ سوچتا طیش میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ سعدیہ بھی لاڈلے کے پیچھے، پیچھے پیر مارتی چلی گئیں۔ زین بے دم سا ہو کر اسی کرسی پر گر گیا جہاں وہ اب سے کچھ دیر پہلے عصر کی نماز پڑھ کر سو گیا تھا۔ اکبر صاحب کا ہاتھ اس کے کندھے تک جاتے، جاتے رک گیا۔ وہ فی الحال پلٹ گئے۔ کمرے کے دروازے سے نکلتے ہوئے ایک بار انہوں نے مڑ کر بیٹے کو دیکھا اور دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوئے۔

''تم بے گناہ ہو۔ تمہاری نظروں کی شرم و حیا تمہاری گواہی دیتی ہے زین۔ لیکن اس وقت میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ تم پر ہاتھ اٹھانے کے بعد تمہیں ادھ مری سی تھپکی دے دوں۔ میرا دل تمہارے لیے دعا گو ہے زین۔ آج سے تمہارے ساتھ ہر قدم پر میری دعائیں رہیں گی۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں مجھ پر ایسا وقت نہ آئے جب تم مجھ سے سوال کرو اور میں جواز پیش کروں۔ ایسا ہوا تو وہی میری سزا ہو گی زین۔'' دو آنسو زین کی پیٹھ کو دیکھتے ہوئے انہوں نے ٹپکائے اور باہر نکل گئے۔

☆☆☆

دو دن سخت بخار میں مبتلا رہنے کے بعد وہ آج اسکول آیا تھا۔ پڑھائی کا حرج ہوا تھا اس لیے سارا دن وہ کلاس میں بیٹھا دو دن کا نامکمل کام مکمل کرتا رہا۔ سلیبس جلدی ختم کروایا جا رہا تھا۔ آج کل کے دنوں میں چھٹی نقصان دہ تھی اور اس سے ایک ساتھ دو ہو گئی تھیں۔ بخار کی حالت میں زویا اور اکبر صاحب زیادہ تر

www.dailyurdubooks.com

وقت اس کے کمرے میں اس کے ساتھ ہی رہے تھے۔ گھر میں جیسے دو دھڑے بن گئے تھے۔ ایک امی اور خضر کا اور دوسرا ابو، نویا اور شاید اس کا۔ وہ خود کو کسی گنتی میں شمار نہیں کرتا تھا۔ لیکن وہ امی اور ابو دونوں کی یکساں توجہ چاہتا تھا، اس طرح ضد بازی سے نہیں بلکہ بالکل خالص اور دل کی گہرائی سے۔ امی نے ابو کی ضد میں اس سے مزید کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ انہیں لگنے لگا تھا جیسے ابو یہ سب کچھ ان کو چڑانے اور خضر کو نیچا دکھانے کے لیے کر رہے ہیں جبکہ ان دونوں میں سے کوئی بھی بات سچ نہیں تھی۔

زین کی پندرہ سالہ زندگی کا ایک ہی نچوڑ تھا کہ جب کوئی گلاس کو آدھا خالی ہی دیکھنا چاہتا ہو تو دنیا کی کوئی دلیل اسے آدھا بھرا ہوا نہیں دکھا سکتی۔ وہ دیکھتا ہی نہیں کیونکہ اس کا دل، دماغ، اس کی حسیات سب آدھے خالی پر مرکوز ہوتی ہیں۔ یہی حال اس کے معاملے میں امی کا تھا۔ وہ اس میں خوبی تلاش کرنا ہی نہیں چاہتی تھیں تو وصف کہاں سے نمایاں ہوتا۔ اور وہ اس تگ و دو سے تھک چکا تھا سر تا پا۔ اب اور نہیں لڑنا چاہتا تھا۔ یہ اس نے خود کو اچھے سے سمجھا لیا تھا لیکن اب ابو نہ جانے کیوں بن کہے اور اچانک سے بیچ میں یہ جنگ لڑنے کود پڑے تھے۔ وہ جنگ جو وہ بھی کا بنا لڑے ہار چکا تھا کیونکہ سامنے دشمن نہیں تھا اس کے اپنے تھے جو اسے سمجھنا نہیں چاہتے تھے اور ''اپنوں کے ساتھ جنگ نہیں کی جاتی سمجھوتے کیے جاتے ہیں۔''

اسکول میں مسلسل کام کرنے کی وجہ سے اسے دوبارہ حرارت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ چھٹی ہوتے ہی نکل آیا تھا کیونکہ آج اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ خضر کے لیے مزید پندرہ بیس منٹ بیکار انتظار کرتا کیونکہ وہ چھٹی کے بعد بھی دوستوں کے ساتھ بلاوجہ وقت ضائع کرتا تھا اور ظاہر ہے اتنی دیر زین کو بھی انتظار کرنا پڑتا تھا۔ پر آج اس کے اندر اتنی سکت نہیں تھی۔ بخار جیسے سر کو چڑھ رہا تھا۔ وہ گھر جانے والی سڑک پر روانہ ہوا جب اس کا ایک کلاس فیلو دور سے اسے آوازیں دیتا بھاگتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں خضر کا بیگ تھا۔ اس نے وہ بیگ زین کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

''خضر نے کہا ہے کہ اسے ابھی کچھ دیر لگ سکتی ہے، تم یہ بیگ اپنے ساتھ لے جاؤ۔ وہ بعد میں آ جائے گا۔''

زین کو غصہ تو بہت شدید آیا لیکن کیا کر سکتا تھا۔ یہیں کہیں رکھ کے بھی نہیں جا سکتا تھا۔ چار و ناچار وہ ایک کندھے پر اپنا اور دوسرے پر خضر کا بیگ اٹھائے چل پڑا۔ سیدھی سڑک کے بعد جو موڑ آتا تھا وہ قدرے سنسان تھا اور درختوں اور خودرو جھاڑیوں کی ایک قطار بنی ہوئی تھی لیکن وہ لوگ عادی تھے اس لیے کبھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ گھومتا سر لیے بمشکل چلتا جا رہا تھا جب ان جھاڑیوں کے پیچھے اسے کسی نقل و حرکت کا احساس ہوا۔ وہ کوئی کتا، بلی سمجھ کر نظر انداز کر گیا لیکن چند قدم چلا ہو گا جب اچانک ارحم وہاں سے نکلا اور اسے پشت سے بیگ سے کھینچ کر نیچے گرا دیا۔ زین ایسے حملے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے بے دم ہو کر گرا اپنا گھومتا سر سنبھالنے لگا۔ ارحم نے وقت ضائع کیے بنا اسے ایک پیر سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا جھاڑیوں میں لے جانے لگا۔ زین کے حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پیر تک چلا نہیں پا رہا تھا۔ جھاڑیوں میں ارحم کا شیطانی دماغ اپنے شیطانی منصوبے پر عمل کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس نے اپنی پینٹ سے بیلٹ نکال کے زین کو الٹا کیا اور اس کے ہاتھ باندھنے لگا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب زین کے حواس بیدار ہوئے۔ کسی غیبی قوت نے اس کی مدد کی اور وہ پورا زور لگاتا سیدھا ہوا۔ اس نے اپنی ٹانگ لہرا کے ارحم کے منہ پر دے ماری۔ ارحم اپنا جبڑا تھامے دُہرا ہوا۔ زین نے کھڑے ہوتے ہوئے ذرا سا جھک کے اپنے دونوں ہاتھوں کے مکے بنا کے لہراتے ہوئے کہا۔

''اگر تم سمجھتے ہو کہ میں ہار مان لوں گا تو غلط ہو۔ یا تو میں یہاں تمہیں سبق سکھا کے جاؤں گا یا پھر یہیں جان دے دوں گا لیکن تمہارا ناپاک مقصد پورا ہونے نہیں دوں گا۔''

ارحم اپنے جبڑے کو سہلاتے ہوئے سیدھا ہوا اور زین پر پل پڑا۔ دونوں میں جم کے لڑائی شروع ہوئی۔

www.dailyurdubooks.com

ارحم، زین سے نہ صرف قد میں لمبا تھا بلکہ قوی بھی تھا پھر بھی زین اسے ٹف ٹائم دے رہا تھا اور یہی چیز ارحم کو آگ بگولا کر رہی تھی۔ وہ جھکا اور ایک موٹا سا پتھر اٹھا کر زین کے سر کا تاک کے نشانہ باندھا۔ پتھر سیدھا اس کی پیشانی پر لگا اور خون بہنے لگا۔ زین اپنا سر لیے وہیں نیچے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ ارحم چھاتی پھلاتا اپنی آستینیں کستا اس تک آیا۔ اسی موقع سے زین نے فائدہ اٹھایا اور مٹھی بھر کے مٹی ارحم کے منہ پر اچھال دی۔ وہ چلاتا ہوا مغلظات بکنے لگا۔ وہ بند آنکھوں میں چبھتی ریت کو ایک ہاتھ سے ملتے اور دوسرے ہاتھ کو سامنے لہرا، لہرا کے زین کو ٹٹول رہا تھا۔ زین اسی زخمی حالت میں اٹھا اور ارحم کو دھکا دے کر گرانے کے بعد اس کے سینے پر چڑھ کے بیٹھ گیا۔ اس نے اسے مسلسل مکوں اور تھپڑوں پر رکھ لیا۔ مار، مار کے جب تک اس کے ناک اور منہ سے خون نہ نکال دیا تب تک وہ اس کے اوپر سے اٹھا نہیں۔ اور جس وقت اسے لگا کہ ارحم میں اب پلٹ کے وار کرنے کی سکت نہیں رہی، تب زین اس کے منہ پر تھوک کر پیچھے ہو گیا۔ اپنا بیگ کندھے پر ڈال کر اور خضر کا بیگ تقریباً گھسیٹتا ہوا وہ جھاڑیوں سے باہر آیا تو وہاں خضر اور اس کا ایک اور دوست بت بنے کھڑے تھے۔ خضر، زین کی خون میں بھیگی سفید شرٹ دیکھ کر سُن رہ گیا تھا۔ زین خون آشام نظریں لیے دونوں کے پاس آیا اور خضر کا بیگ اس کے منہ پر اچھال کر دے مارتے ہوئے بولا۔

”اب سے تم اپنا بوجھ خود ہی اٹھاؤ گے۔ ویسے تمہارے لیے یہ بوجھ ہی ہے کیونکہ جن کتابوں نے تمہیں شرم، حیا، اور اخلاقی اقدار نہیں سکھائیں، وہ تمہارے لیے محض ردی کے کاغذ ہیں۔ اور اگر کل سے.....“ وہ اپنی انگلی لہراتا وارن کرتا ہوا بولا۔ ”تمہیں میں نے دیکھ بھی لیا ناں ارحم کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تو یقین مانو میں تمہارا بھی حشر کر دوں گا خضر۔ بس اب بہت ہو گیا۔“

زین کہتا ہوا دھیمے، دھیمے قدموں سے چلتا گھر کے راستے پر ہو لیا اور پیچھے خضر دیر تک اس کی پشت دیکھتا رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب جو یہاں ہوا تھا وہ زین نے کیا تھا۔ اور جو کچھ زین اسے کہہ کر گیا تھا اس کا اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کر دکھائے گا۔

کسی کو اس کی شرافت سے نہیں آزمانا چاہیے کیونکہ شرافت، بدمعاشی کا لبادہ ہے۔ ظرف وسیع ہو تو یہ لبادہ تمام عمر نہیں اترتا لیکن جو اتار دیتا ہے تو وہ پھر لحاظ نہیں کیا کرتا۔

☆☆☆

گھر میں جو کچھ ہوا وہ الگ کہانی ہے مگر اس دن کے بعد سے خضر کو زین نے ارحم کے ساتھ کلاس میں کبھی بیٹھے نہیں دیکھا۔ زین نے ہمت کی اور پرنسپل کے پاس جا کر ارحم کی ذاتی طور پر شکایت کر دی۔ کچھ جانچ تحقیق کے بعد اسے اسکول سے نکال دیا گیا۔ اسکول میں جیسے یک دم زین نمایاں ہوا تھا۔ یوں لگنے لگا اس سے مقناطیسی شعاعیں پھوٹنے لگی ہیں جو سب کو اپنی جانب کھینچتی تھیں۔ امتحانات تک کا وقت زین کے لیے گولڈن پیریڈ بن گیا۔ خضر کو ہفتہ دس دن کافی افاقہ رہا لیکن اسکول میں زین کی ناموری اسے ہضم کرنا مشکل ترین ہو گیا۔ اساتذہ کو یک دم جیسے زین قابل ترین اسٹوڈنٹ لگنے لگا تھا حالانکہ اس کی ذہنی استعداد بھی اتنی ہی تھی اور قابلیت بھی پہلے جیسی ہی تھی لیکن کوئی کیڈر سٹھی ..... ہی تھی جو سب نے سونگھ لی تھی۔ خضر کی چرب زبانی جیسے ساری کلاس کے کندھوں سے جھڑ گئی تھی اور اس سب کا نتیجہ تھا کہ گھر میں اس نے زین کا جینا محال کر دیا تھا۔ سعدیہ گو کہ اکبر صاحب کی شدید تنبیہ کے بعد زین کو بلاوجہ ڈانٹنے سے گریز کر رہی تھیں لیکن جب خضر من گھڑت شکایات لے، لے کر کچن میں یا کسی اور مصروفیت کے موقع پر پہنچتا تو ان کا پارہ ہائی ہو جاتا۔ وہ زین کے سر پر پہنچ کر اسے بے نقط سناتیں اور خضر کی مانگ پوری کرنے کو کہتیں۔

”خضر کو نوٹس دو اپنے، پہلے اسے یاد کرنے دو اسے پھر تم کر لینا۔“

”اس کی پریکٹیکل کا پیپر کمپلیٹ کر دو، بعد میں اپنی کرنا۔“

”خضر پڑھائی سے بددل ہو رہا ہے زین۔ کسی

www.dailyurdubooks.com
URDU BOOKS

ٹیسٹ میں اس سے کم مارکس لے لو گے تو اس میں جوش پیدا ہوگا، وہ بھی لگن سے پڑھے گا۔ میرا اچھا بیٹا، بھائی بھائیوں کے لیے جان بھی دے دیتے ہیں، تم چند ٹیسٹ میں مارکس کم نہیں لے سکتے۔ کب سمجھو گے تم بڑے بھائی کی قدر زین۔'' یہ اور اس طرح کے کئی اور جملے

سن کر زین سر پکڑ کر رہ جاتا۔ وہ چکی کے دو پاٹوں میں پس رہا تھا اور دونوں پاٹ اس کا رواں، رواں پیس دینا چاہتے تھے۔ دل میں دلائل کا انبار جمع ہو چکا تھا جو وہ ماں کو دینا چاہتا تھا لیکن جرأت نہیں تھی۔ سعدیہ اور خضر اسے مل کر ذہنی اور نفسیاتی دباؤ میں لے رہے تھے۔ لیکن اسے اس بار اپنے لیے اسٹیپ لینا تھا۔ اس نے ابو سے بات کی اور ان کی اجازت سے اپنا کچھ سامان پیک کیا اور توقیر چاچو کے ہاں چلا گیا۔ میٹرک کے ایگزامز تک وہ سکون سے وہیں رہا تھا اور اس بات پر سعدیہ اس سے بری طرح ناراض ہو گئی تھیں کیونکہ انہیں یہ دکھ تھا کہ وہ گھر پر رہ کر خضر کی پڑھائی میں مدد کرتا۔ جبکہ خضر اپنا زیادہ تر وقت بوٹیاں بنانے، جیومیٹری کی اندرونی سائڈ پر چھوٹی، چھوٹی بوٹیاں چپکانے اور محفوظ کرنے میں اور پیپر بورڈ کی بیک سائڈ پر آنکھیں پھوڑ باریک لکھائی میں مشکل سوالات نوٹ کرتا رہتا جو اسے امتحانات میں نقل کرنے تھے۔

☆☆☆

جوں، جوں وقت گزرا زویا، زین سے قریب ہو گئی تھی۔

وہ اس سے سات سال چھوٹی تھی پھر بھی اپنی ہر پرابلم اس سے ڈسکس کرنا پسند کرتی تھی۔ وہ ماں اور باپ دونوں کی لاڈلی تھی اس لیے موڈی بھی تھی لیکن خودسر نہیں تھی۔ اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ زین کے ساتھ کی وجہ سے آیا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر بھائی کی اچھی عادات کو کاپی کرتی تھی اور سعدیہ کو دونوں کی عادتوں میں مماثلت حیران کرتی تھی۔ انہیں اب زین کی طرح زویا سے بھی شکایت تھی کہ وہ خضر کے قریب نہیں تھی۔ جوں، جوں وقت گزرا تھا وہ پہلے سے زیادہ خضر کو بڑھاوا دینے لگی تھیں۔ انہیں گھر کا سب سے مظلوم اور ستایا ہوا فرد اپنا بڑا بیٹا لگتا تھا جسے نہ باپ پیار کرتا تھا نہ بہن بھائی۔ لیکن انہوں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ باپ کے رویے میں کھنچاؤ کیوں آیا اور بہن بھائی اس سے دور کیوں ہوئے؟

دونوں بھائی ایک ہی کالج میں گئے تھے۔ زین کا رجحان میڈیکل کی طرف تھا اس لیے اس نے پری میڈیکل میں داخلہ لیا تھا اور خضر کو ماں نے اکسایا تھا کہ وہ باپ سے ضد کر کے پری انجینئرنگ میں داخلہ لے جبکہ اس کے مارکس میرٹ سے کم تھے اور اسے زین کے کالج میں داخلہ ملنا بہت مشکل تھا۔ اب جبکہ زین پری میڈیکل کرنے جا رہا تھا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ خضر اس کی ٹکر کا نہ پڑھتا۔ اکبر صاحب نے کہہ سن کر بہت کوشش کی کہ کسی طرح اسے داخلہ مل جائے لیکن بات نہیں بنی۔ آخری چارہ سیلف فنانس کی صورت تھا لیکن اس کے لیے اکبر صاحب نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ وہ رقم ارینج کر سکتے تھے پر خضر کے لیے کرنا چاہتے نہیں تھے۔ میٹرک کے ایگزامز کے بعد اس کی نااہلی اس قدر نمایاں ہو چکی تھی کہ وہ اس پر اپنی محنت کی کمائی برباد کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ خضر نے بمشکل میٹرک کلئیر کیا تھا جبکہ زین کے مارکس بہترین تھے اور جب تک رزلٹ نہیں آیا تھا، زین وقت ضائع کرنے کے بجائے چھوٹے موٹے کمپیوٹر کورسز کرتا رہا تھا۔ خضر نے تمام وقت آوارہ گردی کے ریکارڈ توڑے تھے، وہ بھی ماں کی مکمل پشت پناہی کے ساتھ۔ آگے بھی وہ جانتے تھے کہ خضر کچھ نہیں کرنے والا لیکن گھر میں سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔ وہ ویک اینڈ پر گھر آئے اور مکمل تناؤ سے بھرا ماحول دیکھ کر ان کی طبیعت خاصی مکدر ہوئی۔ خضر کی بے ادبی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ان کے آنے پر وہ کمرے سے باہر تک نہ آیا اور ماں نے نروٹھے پن سے یہ کہہ کر طرفداری کی کہ ''بچہ بہت دل شکستہ ہے، آپ باپ ہیں، باظرف بنیں۔ آخر اولاد کے لیے ہی تو کما رہے ہیں۔ اسی پر نہیں لگائیں گے تو کس پر لگائیں گے۔'' جواباً اکبر صاحب نے خوب سنائی تھیں اور

www.dailyurdubooks.com

صاف، صاف کہہ دیا کہ ”میری کمائی پر صرف ایک ہی اولاد کا حق نہیں ہے اور پہلے بھی بہت بار خضر کی خاطر زین کی حق تلفی کر چکا ہوں اب مزید نہیں کروں گا۔“

بات آئی گئی نہیں ہوئی بلکہ گھر میں کشیدگی مزید پھیل گئی۔ اکبر صاحب نے ٹھان لی تھی کہ اس بار وہ نہیں جھکیں گے۔ اس شام کو زویا اپنے ہاتھوں سے ان کے لیے چائے لے کر آئی تو پاس ہی بیٹھ گئی۔ اکبر صاحب نے محبت پاش نگاہوں سے بیٹی کو دیکھا جس میں وقت کے ساتھ خاصی تبدیلی آ گئی تھی۔

”ابو، ایک بات کہوں آپ سے؟“ وہ باپ سے بات کرنے میں ہچکچاتی نہیں تھی اس لیے تمہید بھی نہیں باندھی تھی۔

”کچھ چاہیے میری گڑیا کو؟“ اکبر صاحب نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔ زویا نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”اپنے لیے نہیں چاہیے ابو۔ اپنے بھائیوں کے لیے چاہیے۔“

اکبر صاحب کے ہاتھ پر بل پڑے۔ چائے کے مگ کے کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے وہ خاموشی سے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگے۔

”ابو، آپ خضر بھائی کا ایڈمیشن کروا دیں کسی بھی طرح پلیز ابو ورنہ وہ زین بھائی کا جینا محال کر دیں گے۔ امی آپ کو پتا ہے نا، خضر بھائی کی باتوں میں آ جاتی ہیں اور پھر آپ تو چلے جاتے ہیں ویک اینڈ گزار کے۔ پیچھے زین بھائی بہت مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔“

وہ سیدھا ماں کا نام نہیں لے رہی تھی حالانکہ وہ جانتے تھے کہ اکیلا خضر نہیں جو زین کو پریشان کرتا ہے۔

”پلیز ابو، مجھے اپنے دونوں بھائیوں سے محبت ہے لیکن زین بھائی نے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی کبھی کسی بات کے لیے لڑائی نہیں کی اور ڈاکٹر بننا ان کا اولین خواب ہے۔ اگر آپ نے خضر بھائی کا ایڈمیشن نہ کروایا تو زین بھائی کبھی سکون سے پڑھ نہیں پائیں گے۔ پلیز ابو کچھ کریں۔ آپ ہی کر سکتے ہیں۔ زین بھائی کی خاطر۔“

زویا ساتویں جماعت میں تھی لیکن اس کی گفتگو کا انداز اور لب و لہجہ انہیں اپنی ماں کی یاد دلا گیا تھا۔ وہی مدلل لیکن التجائیہ انداز اپنی بات منوانے کا۔ وہ مسکرائے اور بیٹی کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ پُرسوچ نگاہیں غیر مرئی نقطے پر جمائے، چائے کے گھونٹ بھرتے وہ سنجیدگی سے زویا کی بات پر عمل کرنے کا سوچ رہے تھے۔

☆☆☆

کالج لائف ہر طالب علم کی زندگی میں ایک ”ایڈونچرس جرنی“ کی طرح ہوتی ہے۔ روز نت نئے تجربات اور مشاہدات۔

زین اور خضر کی کالج لائف بھی شروع ہو گئی تھی۔ دونوں خوش تھے اور جوش بھی تھا۔ ڈاکٹر بننا زین کا وہ خواب تھا جو اس نے تب سے دیکھنا شروع کیا جب ایک بار وہ بچپن میں چھت کی سیڑھیاں اترتے ہوئے گرا اور بری طرح گھٹنا چھلوا بیٹھا۔ دوپہر کا وقت تھا اور امی سو رہی ہوتی تھیں۔ وہ سہما، سہما لنگڑاتا ہوا چلتا ماں کے سرہانے آ کھڑا ہوا۔ کروٹ کے بل لیٹی وہ گہری نیند میں تھیں۔ اس نے ہلکی، ہلکی دو تین آوازیں دیں کہ ماں نیند سے جاگ گئی تو ٹھیک ورنہ واپس ہو لے گا۔ اندر یہ خوف بھی تھا کہ کہیں مار نہ پڑ جائے کیونکہ امی کو نیند سے جگائے جانا سخت ناگوار گزرتا تھا۔ وہ ماں سے کہنے کا ارادہ ترک کر کے کچن میں چلا آیا۔ اسے معلوم تھا کہ فرسٹ ایڈ باکس یہیں کہیں رکھا ہوتا ہے۔ تھوڑی تلاش بسیار کے بعد وہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر وہیں ایک طرف رکھی پیڑھی پر بیٹھا اور ٹانگ سامنے پھیلا کر گھٹنے کو دیکھنے لگا۔ یک دم اس نے دوسری پیڑھی اٹھائی اور اپنے سامنے رکھ کر اس پر اپنی ٹانگ رکھ دی اور اپنی آواز کو قدرے بھاری بنا کے کہنے لگا۔

”جی بیٹا، کیا ہوا ہے آپ کو۔ اوہو..... یہ تو بڑی سخت چوٹ لگ گئی آپ کو۔“ ایک ڈاکٹر کی طرح اس نے سامنے رکھی پیڑھی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اپنی اصل آواز میں جواب دیا۔

”ڈاکٹر انکل چوٹ لگ گئی بہت سخت۔ بہت، بہت درد ہو رہا ہے۔ ہائے، ہائے۔“ وہ درد سے لوٹ پوٹ ہونے کی ایکٹنگ کرتا ہوا نقلی ڈاکٹر کو بتا رہا تھا۔

www.dailyurdubooks.com
DAILY URDU BOOKS

''اچھا، اچھا بیٹا حوصلہ رکھو۔ یہ تو بڑا بہادر بچہ ہے۔ ہے ناں۔ کون سی کلاس میں پڑھتا ہے یہ بیٹا؟''

ڈاکٹر بن کے اپنے زخم کا خود ہی جائزہ لیتے ہوئے اس نے فرسٹ ایڈ باکس کھول کر اندر سے سرخ محلول والی شیشی نکالی اور ساتھ میں مریض بچے یعنی خود سے ہی سوال کیا۔ جواباً وہی درد میں ڈوبی آواز نکلی۔

''کلاس سکس۔ ہائے، ہائے۔''

''واہ جی واہ، یہ تو بہت لائق بچہ ہے۔ چلو سکس کا ٹیبل تو سناؤ ذرا۔'' ڈاکٹر صاحب اب روئی پر وہ سرخ دوا لگاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''مم... م... مجھے آتا ہے۔ ایک منٹ۔ سکس ونز آ سکس۔ سکس ٹوز آ۔''

مریض کے ٹیبل سنانے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے روئی کا پھایا اس کے زخم پر رکھ دیا۔ مریض درد سے چلایا۔

''آ۔ آ۔ او..... ہائے۔''

''اچھے اور بہادر بچے تو کبھی نہیں روتے۔ آپ تو اتنے بہادر ہو کہ اپنی امی کے بغیر آ گئے۔ ان کو تو پتا بھی نہیں کہ آپ کو اتنی سخت چوٹ لگی ہے۔ یہ ہوتے ہیں بریو بچے۔ ہے ناں'' خیالی ڈاکٹر نے اصلی مریض کا دکھ زبان سے بیان کیا اور پھر خیالی نرس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نرس بینڈیج دیں پلیز۔ ابھی ہم پٹی کر دیں گے تو رات تک درد بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ ٹھیک ہے ناں بیٹا۔''

نرس سے پٹی پکڑ کر ڈاکٹر صاحب نے مریض کے گھٹنے کی پٹی کی اور پھر دو تھپکیاں دے کر مریض کو کھڑا کیا۔ مریض دو قدم چلا تو کراہ اٹھا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''آرام سے آرام سے۔ زیادہ زور نہیں ڈالنا۔ تھوڑا درد ہو گا پھر ٹھیک ہو جائے گا۔ اب آپ گھر جاؤ اور امی سے کہنا دودھ کے ساتھ دوائی کھلا دیں۔''

اتنا کہہ کر ڈاکٹر کی آواز پھر بھر آئی اور وہ مریض بن کر اپنا گھٹنا تھامے سسک، سسک کر رونے لگا۔ اس دن جب وہ ڈاکٹر بنا اپنا ہی علاج کر رہا تھا تب اس نے ارادہ کیا تھا کہ وہ بڑا ہو کر ڈاکٹر بنے گا اور بہت محبت سے سب کا علاج کیا کرے گا۔ اس نے کبھی بھی اس خواب کو خود سے دور نہیں کیا تھا۔ اب جب وہ منزل کے بے حد قریب آ گیا تو قسمت ایک بار پھر اسے آزمانے کے لیے پر تول رہی تھی۔

ایف ایس سی میں دو سال خوب محنت کرنے کے بعد وہ اچھے مارکس اسکور کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اسے تو تھا ہی، اکبر صاحب کو بھی یقین تھا کہ اس کا داخلہ کسی بھی میڈیکل کالج میں بہ آسانی ہو جائے گا۔ اس کی محنت اور لگن رنگ لے آئی تھی لیکن رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے خضر آستینیں کسے سامنے موجود تھا۔ بدقسمتی سے وہ اچھے نمبرز تو دور بمشکل ایف ایس سی کلئیر کر سکا تھا اور یہ اس کے خود سے زیادہ زین کے حق میں برا ثابت ہوا تھا۔

☆☆☆

اکبر صاحب زین کی کامیابی پر بے حد خوش تھے اور وہ چاہتے تھے کہ زین کو لاہور کے میڈیکل کالج میں داخلہ مل جائے تو اچھا ہو گا۔ اس طرح سے وہ ان کے قریب رہ کر بہ آسانی پڑھ سکتا تھا۔ ہاسٹل کے بجائے وہ ان کے ساتھ رہتا تو جو توجہ وہ بچپن میں اسے کبھی نہیں دے پائے تھے، اس کی کمی پوری کر سکتے تھے۔

لیکن جب وہ ویک اینڈ پر گھر آئے تو ایک بہت بڑا معرکہ ان کا منتظر تھا۔ خضر نے گھر میں تماشا کھڑا کر رکھا تھا کہ اگر وہ انجینئرنگ نہیں کر سکا تو زین بھی میڈیکل نہیں کرے گا۔ اکبر صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ دل تو چاہا کہ خضر کے قد کاٹھ کا لحاظ کیے بنا آج جوتا اتار ہی لیں اور اس کا دماغ ٹھکانے لگا دیں۔ وہ زین کی اتری شکل دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ گھر میں یہ ہنگامہ تازہ نہیں ہے بلکہ اسے کئی دن گزر چکے ہیں۔ خضر سے بات کرنے اور اسے سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ جو اطوار شروع سے اس کی تربیت کا حصہ بن چکے تھے وہ انہیں کیونکر بدل سکتا تھا؟ وہ منواتا آیا تھا اور اب بھی مصر تھا کہ اس کی مانی جائے۔ وہ زین کی کامیابی برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ اسے اول

www.dailyurdubooks.com
URDU BOOKS DAILY

دان سے سمجھایا گیا تھا کہ وہ برتر و اعلیٰ ہے اور جو اچھا ہے وہ اسی کے لیے ہے جو اسے پسند نہ آئے وہ چھوٹے بھائی کو دے دو۔ بچوں میں اونچ نیچ کا پیمانہ بناتے وقت والدین بھول جاتے ہیں کہ اس پیمانے پر ایک بار جسے اونچ پر کھڑا کر دیا جائے وہ کبھی بھی نہیں جھکتا اور نہ نیچے والے کو اونچائی پر آنے دیتا ہے۔ نتیجتاً مقابلے بازی کی فضا کے در پردہ خود غرضی اور نفرت جنم لیتی ہے اور خونی رشتوں میں حُب ختم ہو جاتی ہے۔

اکبر صاحب کو یقین تھا کہ اس معاملے میں سعدیہ یقیناً غیر جانبدار ہوں گی کیونکہ کوئی ماں اپنی اولاد کا مستقبل خراب ہوتے کب دیکھ سکتی ہے، اسی لیے انہوں نے بیوی سے تمام صورتِ حال پر بات کی پر ان کا جواب ان کی سوچ کے برعکس تھا۔

''دیکھیں اکبر میرا نہیں خیال کہ زین کی میڈیکل کی پڑھائی ہم افورڈ کر سکتے ہیں۔ پھر کیا ضرورت ہے بڑے بھائی کو نیچا دکھانے کی۔ خضر ڈسٹرب ہو جائے گا اکبر۔ اگر اس کا انجینئرنگ یونیورسٹی کا میرٹ بن جاتا تب بھی میں زین کے میڈیکل میں جانے کے حق میں نہیں تھی۔ دیکھیں ناں ہم خضر کے اخراجات ہی بمشکل اٹھا پاتے کجا کہ میڈیکل کی اتنی مہنگی پڑھائی۔ اور پھر زین ماشاء اللہ اتنا لائق ہے کہ کسی بھی فیلڈ میں جائے، کامیاب ہو ہی جائے گا لیکن آپ خضر کا سوچیں۔ اس کا ذہن منتشر ہے اور اگر ابھی ہم نے فوری قدم نہ اٹھایا تو وہ خدانخواستہ خود کو کوئی نقصان پہنچا لے گا۔ اور اگر اسے کچھ ہوا اکبر تو میں کسی کو معاف نہیں کروں گی۔ آخر ایک چھوٹی سی التجا ہی تو کر رہا ہے میرا بچہ کہ زین کو سادی پڑھائی کی لائن پر لگایا جائے اس کی طرح، تو اچھا ہی ہے ناں۔ کیا کرنا ہے ہم نے اسے ڈاکٹر بنا کے۔ بھلا آج کل ڈاکٹری میں رکھا ہی کیا ہے۔''

اکبر صاحب دنگ سے بیوی کی شکل دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے بھائی کا بھائی کے لیے بہن، بھائی کا ایک دوسرے کے لیے خون سفید ہوتے تو بہت بار دیکھا تھا لیکن ایک ماں کا اپنی ہی اولاد کے لیے ایسا سنگین رویہ پہلی بار دیکھا تھا۔ ان کے دل میں یک دم آتش فشاں ابلا تھا جس کے اثر سے ان کی زبان نے پہلی بار گھر میں انگارے برسائے تھے۔ ان کی چنگھاڑ کی آواز بند کمرے میں خضر کے کانوں نے بھی سنی تھی۔

''جس کو جو کرنا ہے کر لے سعدیہ بیگم۔ لیکن اس بار جو میرا بیٹا زین چاہے گا وہی ہو گا۔ وہ میڈیکل کرے گا تو بس کرے گا۔ خضر کو آگے پڑھنا ہو تو کالج میں ایڈمیشن لے، لے ورنہ بیٹھ رہے گھر لیکن اگر وہ زین کی راہ میں آیا تو میں خود اس کے پرخچے اڑا کے رکھ دوں گا۔ سمجھ جاؤ تم بھی اور تمہارا سگا لاڈلا بھی۔ زین میڈیکل کرے گا اور یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔''

اکبر صاحب اپنی بات مکمل کر کے سعدیہ کو ہق دق چھوڑ کے گھر سے نکل گئے تھے۔ سعدیہ شوہر کے رویے کو دیکھ کر اتنی بے یقین تھیں کہ انہیں کچھ دیر کے لیے کچھ بھی سجھائی نہیں دیا۔ زویا متاسف اور ناراض سی ماں کو دیکھتی ان کے لیے پانی لینے چلی آئی۔ اپنے کمرے میں زین اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھا کنپٹیاں دباتے ہوئے سارے مسئلے کو شروع سے سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسری جانب خضر نے بہت آرام سے اپنے کمرے کا دروازہ بنا آواز کے بند کیا اور ہاتھ میں پکڑی سلیپنگ پلز کی شیشی اپنی ہتھیلی پر انڈیلی۔ نفرت و قہر اس وقت اس کے پورے وجود میں شرارے دوڑا رہا تھا۔ واش روم کے نل سے گلاس میں پانی بھر کے لایا اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کے ساری گولیاں پھانک لی۔ تسلی سے پانی پیا اور اٹھ کے کمرے کا دروازہ ان لاک کیا۔ سلیپنگ پلز کی خالی بوتل کو سائڈ ٹیبل پر نمایاں جگہ پر رکھا۔ اسٹڈی ٹیبل کی چیئر کو زوردار آواز کے ساتھ نیچے گرایا۔ ٹیبل سے کتابیں فرش پر پھینکیں اور سکون و اطمینان سے بیڈ پر چت لیٹ کے کمبل سینے تک تان لیا۔

☆☆☆

سعدیہ کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا اور وہ دو دن سے اسپتال میں تھیں۔ اکبر صاحب افتاں و خیزاں کبھی جوان بیٹے کی جانب دیکھتے تو کبھی شریکِ حیات کی طرف جس نے بیٹے کی خودکشی کرنے کا ایسا صدمہ لیا تھا کہ خبر سنتے ہی چاروں شانے چت ہوئی تھیں۔ خود

www.dailyurdubooks.com
URDU BOOKS

ان کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔ وہ بیوی سے لڑ کر گھر سے باہر تو چلے گئے تھے لیکن چین نہیں آیا بلکہ الٹا دل کو گھبراہٹ سی ہوئی تو واپس ہو لیے۔ سعدیہ ابھی تک لاؤنج میں ایک ہاتھ میں پانی کا گلاس تھامے تھیں تو دوسرے سے پیشانی مسل رہی تھیں۔ وہ انہیں نظرانداز کرتے اندر کمرے کی جانب بڑھے جب زویا کی زوردار چیخ کی آواز نے ان کے حواس جھنجھنا کر رکھ دیے۔ زین بھی گھبرا کر اپنے کمرے سے نکل آیا تھا۔ وہ فطری طور پر سیدھا ماں، باپ کی جانب بڑھا مبادا ان میں سے کسی کو کچھ ہوا ہو۔

سعدیہ اور اکبر صاحب نے اس طرف دوڑ لگا دی جہاں سے زویا کے چلانے کی آواز آئی تھی لیکن ان سے پہلے زویا روتی چلاتی وہیں پہنچ گئی۔ اڑی ہوئی رنگت اور کپکپاتے وجود کے ساتھ اس کے ہونٹوں سے بمشکل فقرہ ادا ہوا تھا۔

''خضر بھائی بھائی نے خودکشی کر لی ہے ابو۔''

سب کے پیروں سے گویا زمین ہی نکل گئی تھی۔

اکبر صاحب نے سینہ مسلتے ہوئے خضر کے کمرے کی جانب قدم بڑھائے ادھر سعدیہ پورے قد سے فرش پر گریں۔ وہ پلٹ کر بیگم کو دیکھنے لگے۔ زین اور زویا بھی ماں کی جانب لپکے۔ اکبر صاحب کے ہاتھ پیر صحیح معنوں میں پھول گئے تھے۔ وہ زویا کو ماں کا خیال رکھنے کا اور زین کو توقیر کو کال کرنے کا کہہ کر خضر کے پاس چلے گئے جہاں وہ پوری تیاری کے ساتھ تسلی سے بستر پر بیہوش پڑا تھا۔ اکبر صاحب کی آنکھوں میں ... بے بسی سے آنسو بھر گئے۔ وہ کبھی گمان بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اولاد کے ہاتھوں ایسے رسوا ہوں گے۔ توقیر جھٹ پٹ پہنچے تھے اور وہ دونوں سعدیہ اور خضر کو ایک ساتھ اسپتال لے کر روانہ ہوئے تھے۔ یہ ایسی افتاد تھی جس نے یک دم جیسے سب کے ذہنوں کو مفلوج کر دیا تھا۔ زین دکھ سے زویا کو تسلی دیتا رہا اور وہاں اسپتال میں اکبر صاحب بیٹے اور بیوی کو لیے خوار ہوتے رہے۔ سعدیہ کا سیریس نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا اور ڈاکٹروں نے انہیں ابھی ان کی جانب سے تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا۔ خضر البتہ تین گھنٹے ان سب کو سولی پر لٹکائے رکھنے کے بعد خطرے سے باہر تھا۔ اس کا معدہ صاف کر دیا گیا تھا۔ توقیر نے پولیس تک معاملہ جانے سے روک لیا تھا لیکن انہیں بھتیجے کی ایسی حرکت کا افسوس سے زیادہ غصہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ شدت پسند ان کا بھتیجا اپنی منوانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا اور ان کی بھابی تو بیٹے کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کی مرید ہو گئی تھیں۔ خضر سے پہلے کچھ تو نہ اس کے بعد۔ بینچ پر بیٹھ کر ساتھ بیٹھے نڈھال اور پریشان حال بڑے بھائی کو دلاسا دیتے ہوئے ان کی سوچیں مسلسل زین کے گرد منڈلا رہی تھیں۔ ایک بھائی کی خودغرضی اور چالاکی کی بھینٹ اسی کے سگے بھائی کا مستقبل چڑھنے والا تھا۔ اس کا افسوس انہیں ہمیشہ رہنے والا تھا۔

☆☆☆

اکبر صاحب نے آفس سے مزید ایک ہفتے کی چھٹی لے لی تھی۔ گھر میں ان کی ضرورت تھی اور ویسے بھی واپس جا کر ان کا دل یہیں اٹکا رہتا۔ خضر فاتح بن کر گھر لوٹا تھا۔ نہ کوئی شرمندگی نہ کوئی ملال۔ ماں کی نڈھالی اور بیماری کو اس نے خراج سمجھ کر وصول کیا تھا۔ اس کی گردن مزید تن گئی تھی جب اسے پتا چلا تھا کہ ماں کا اس کی خودکشی کی خبر سن کر نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ سعدیہ بھی شوہر سے شاکی تھیں کہ اگر انہوں نے بروقت معاملہ سنبھال لیا ہوتا تو خضر ایسا خطرناک قدم اٹھاتا اور نہ وہ موت کے منہ کو چھو کر آتیں۔ انہیں اب بھی یہ سوچ، سوچ کر جھٹکے لگتے تھے کہ اگر ان کے بیٹے کو کچھ ہو جاتا تو وہ کیا کرتیں بھلا۔

تو ثابت ہو گیا تھا کہ زور آور کا بس چلے تو وہ دس کے سات نوٹوں کو سو ثابت کر دے۔ اکبر صاحب نے ہار مان لی تھی۔ وہ ایک بار پھر نہیں وہ ہر بار ہی ہار جاتے تھے۔ انہوں نے مان لیا تھا کہ قدرت اب ان سے زین کی تکلیفوں کا ازالہ نہیں چاہتی۔ شاید وہ انہیں سستے میں چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ شکستہ سے اندھیرا کیے لاؤنج میں اکیلے بیٹھے تھے۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا کھایا تھا نہ رات کا۔ توقیر

www.dailyurdubooks.com
URDU BOOKS

کی مہربانی تھی جو وہ اتنے دن سے اپنے گھر سے کھانا بھجوا رہے تھے ورنہ چھوٹی سی زویا ابھی اس قابل نہیں تھی کہ کھانا پکا سکتی۔ سعدیہ کو ابھی ڈاکٹرز نے زیادہ چلنے پھرنے سے منع کیا تھا اور کسی قسم کا بھی ذہنی دباؤ ان کے لیے خطرناک ثابت ہوتا۔ اسی ڈر کے پیشِ نظر آج صبح اکبر صاحب نے بہت سبھاؤ سے بیوی سے بات کرنے کی آخری کوشش کی تھی۔

''خضر نے جو کرنا تھا کرلیا۔ مرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اسے بھی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ خودکشی کرنے کے بعد انسان پر کیا بیتتی ہے جب تک جان نہ نکل جائے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے جذباتی پن میں کافی افاقہ ہوا ہوگا۔ اب تم اسے سمجھاؤ اور اس کی بیکار ضد سے باز رکھنے کی کوشش کرو۔ زین کا ایڈمشن ہوجائے گا تو اسے میں اپنے پاس لاہور رکھ لوں گا۔ نہ وہ خضر کے سامنے ہوگا نہ چپقلش پیدا ہوگی۔'' وہ نگاہیں جھکائے ناگوار لیکن محتاط لہجے میں خضر کے بارے میں بات کررہے تھے جبکہ سعدیہ انہیں پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھے جا رہی تھیں۔ جب وہ بول چکے تو انہوں نے سعدیہ کے تاثرات جاننے کے لیے ان کی آنکھوں میں دیکھا اور ٹھٹک گئے۔

''کیا ہوا، چپ کیوں ہو۔ بولو کچھ؟''

''کیا بولوں، بولنے قابل چھوڑا ہے آپ نے؟'' وہ غرائیں۔

''اتنا کچھ ہوگیا۔ میں اور میرا بچہ مرتے، مرتے بچے ہیں اور آپ کو اب بھی زین کی پڑی ہے اکبر۔ آپ اتنے ظالم اور کٹھور کیسے ہوسکتے ہیں۔ آپ پوری پلاننگ کر کے کیسے رٹے رٹائے جملے بولتے چلے جا رہے ہیں۔'' ان کا تنفس تیز ہونے لگا تھا۔ ''میری بات دھیان سے سن لیں اکبر۔ نہ آج نہ کل، نہ زندگی میں کبھی زین میڈیکل میں جائے گا۔ سن لیا آپ نے۔ بہت ہوا تماشا۔ اب اگر آپ نے مزید میرے ساتھ ضد کی تو اس بار میں گولیاں پھانک لوں گی اور میرا وعدہ ہے کہ میں خود کو بچانے کی مہلت بھی نہیں دوں گی کسی کو۔ بس۔ بہت ہوا اب۔''

انہوں نے ہاتھ اٹھا کر یہ موضوع ہمیشگی بند کردیا تھا۔ اکبر صاحب گنگ سے وہاں سے اٹھ کر چلے آئے اور اب ایک ہی جگہ بیٹھے سوچ، سوچ کر انہوں نے رات کرلی تھی۔ وہ زین کے لیے تکلیف اور دکھ محسوس کرتے ہوئے بچوں کی طرح سسکتے رہے تھے۔ پہلی بار وہ اس کا سامنا کرنے سے گھبرا رہے تھے۔ ایسی گھبراہٹ انہیں تب بھی محسوس نہیں ہوئی تھی جب بچپن میں زین اغوا ہوگیا تھا۔ جیسے ہی انہیں خبر ملی کہ وہ خیریت سے گھر پہنچ چکا ہے تو وہ جو گھر کے لیے نکلنے والے تھے، دوبارہ رک گئے تھے اور پھر جب ویک اینڈ پر آئے تو زین نے انہیں اس قدر شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھا تھا کہ اگر ایسی نگاہ پتھر پر پڑتی تو وہ چیخ جاتا لیکن نہ جانے ان دونوں میاں بیوی کے دل کیسی مٹی سے بنے تھے جو ایک اسی کی خاطر پگھلتے نہ تھے۔ وہ بیتا وقت انہیں اب بھی یاد آکے آکر ستاتا تھا لیکن اب جبکہ وہ زین کے لیے کچھ اچھا کر کے اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرنا چاہتے تھے تو موقع ان کے ہاتھوں سے نکل رہا تھا۔

وہ متورم اور تھکن سے بوجھل آنکھیں لیے کھڑے ہوئے اور سونے کے ارادے سے کمرے کا رخ کرنے والے تھے کہ عقب سے زین کی پکار پر ان کے قدم وہیں جم گئے۔ وہ پلٹ کے دیکھنے سے گریزاں تھے۔ زین خود ہی چلتا ہوا ان کے سامنے آیا اور ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر عقیدت سے آنکھوں کو لگاتے ہوئے بولا۔

''کب تک یوں بیٹھے رہیں گے ابو۔ جو چیز نصیب میں نہیں اس کے پیچھے ہلکان ہونا بیوقوفی ہے اور یہ بات میں نے بہت چھوٹی سی عمر میں سیکھ لی تھی۔ تو پھر آپ کیوں نہیں سمجھ پا رہے۔ میں ڈاکٹر بن کر لوگوں کے درد کی دوا بننا چاہتا تھا لیکن شاید ایسا کرنے کا کوئی اور راستہ بھی ہو۔ اور جو راہ میری تقدیر میں ہے اسے وقت خود چن کر میرے سامنے لا رکھے گا۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں اور آپ بھی اپنے دل سے ہر قسم کا بوجھ اتار دیں۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں بی ایس سی

www.dailyurdubooks.com

....کروں گا۔ بلکہ میں نے ارادہ کیا ہے کیونکہ فیصلہ کرنا مجھے راس نہیں آتا۔ کیا خیال ہے آپ کا؟''

وہ ہلکی آواز میں ہنستا ان سے پوچھ رہا تھا اور اکبر صاحب نے کھینچ کر اسے سینے میں بھینچ لیا۔ اپنے ہی گھر میں وہ سربراہی حیثیت میں اتنے لاچار ہو گئے تھے تو ماضی میں زین کا ننھا وجود کس کس طرح تختۂ مشق بنتا نہیں ہوگا۔ باپ کے سینے سے لگے زین کی آنکھوں سے چپکے سے دو آنسو نکلے جنہیں اس نے باپ کے شانے کا بوجھ بننے سے پہلے ہی اپنی ہتھیلی میں سمیٹ لیا۔

☆☆☆

آٹھ سال بعد

یہ شہر کا بہترین کالج تھا۔ طلبا کی کثیر تعداد یہاں زیرِ تعلیم تھی اور اس کالج کی اچھی ریپوٹیشن کی بنا پر اس کا شمار چند بہترین کالجز میں ہوتا تھا۔

''ڈسپلین اینڈ ڈگنٹی'' کا بڑا سا لوگو کالج کے داخلی گیٹ پر آویزاں تھا۔ یہاں کے ماحول کی خاص بات اساتذہ کا دوستانہ برتاؤ اور طلباء کا پُراعتماد رویہ تھا۔ اس کے باوجود استاد اور طالب علم کے درمیان ادب اور احتیاط کا توازن برقرار تھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد گیٹ سے لے کر کلاسوں تک لمبے چوڑے کاریڈورز میں گروپس کی شکل میں کھڑے طلبا کسی بھی پروفیسر یا لیکچرار کے گزرنے پر ایک سا مؤدب انداز اختیار کرتے۔ کالج کی عمارت کے وسط میں بہت بڑا گھاس کا میدان تھا اور سارے گراؤنڈ میں ایک ترتیب اور انداز سے ٹریکس بنائے گئے تھے۔ گراؤنڈ کو چاروں طرف سے سرو کے درختوں نے گھیر رکھا تھا جن کے پار کلاسز کے کاریڈورز چھپ جاتے تھے۔ ان درختوں کی وجہ سے گرمیوں میں ان کلاسز اور کاریڈورز میں تسکین آمیز سی ٹھنڈک رہا کرتی۔ اس وقت صبح کے آٹھ بج چکے تھے اور طلبا اپنے، اپنے مطلوبہ ڈیپارٹمنٹ کا رخ کر رہے تھے۔ فیکلٹی گیٹ سے ایک خوب صورت بلو کلر کی ٹیوٹا ایکوا اندر داخل ہوئی اور سیدھی پارکنگ ایریا میں جا کر رکی جہاں اور بھی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کافی فاصلے پر کھڑے لڑکیوں کے گروپس میں خفیف سی ہلچل پیدا ہوئی اور لڑکے بھی الرٹ سے اس جانب متوجہ ہو گئے۔ سی گرین فینل نیک سویٹر کے ساتھ بلیک جینز پہنے، ہلکی نمی لیے خوب صورت بالوں کو نفاست سے سیٹ کیے۔ آنکھوں پر نظر کا خوب صورت اور نفیس چشمہ لگائے، ہلکی بڑھی ہوئی شیو لیے ایک خوش شکل اور ہینڈسم مرد گاڑی سے اترا اور اسے لاک کرتا چابی کے رنگ کو انگشتِ شہادت میں پھنسائے دوسرے میں لیپ ٹاپ بیگ پکڑے ناک کی سیدھ میں آگے بڑھ گیا۔ طلبا کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس کے چہرے پر خوب صورت مسکراہٹ تھی مگر وقار بھی غضب کا تھا۔ ایک دوستانہ رعب اس کی پوری شخصیت پر چھایا تھا حالانکہ وہ کرخت مزاج ہرگز نہیں تھا لیکن اس سے بات کرتے وقت سب خود بخود محتاط ہو جاتے تھے۔ لڑکیوں کی نگاہیں پلٹ، پلٹ کر اس پر پڑتیں اور پھر پلٹ آتیں لیکن سیر نہ ہوتیں۔ لڑکے الگ اس کے دیوانے تھے۔ یہ ویل گرومڈ، پُراعتماد اور نفیس شخص اسسٹنٹ پروفیسر زین اکبر ہمدانی تھا۔ جسے اس کالج میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر جاب کرتے بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن کالج میں اس کی دھاک خوب

غزل

یوں داستانِ عشق کے اندر رہیں گے ہم
آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر رہیں گے ہم
کر تو رہا ہے آج بے توقیر تُو ہمیں
کل خواب تیری آنکھ کا سُندر رہیں گے ہم
منزل یہ کارِ عشق کی طے کر گئے اگر
فرہاد و قیسِ نجد کے ہم سر رہیں گے ہم
اس شہر میں رہیں گی یوں ہی کیا عداوتیں
گلشن میں خارزار کا منظر رہیں گے ہم
تھک جائے گا تُو مانگ کے ہم کو دعاؤں میں
تیرے خیال و خواب کا محور رہیں گے ہم

شاعرہ: یمنیٰ احمد
پسند: مونا رضوان، کراچی

www.dailyurdubooks.com
URDU BOOKS

بیٹھ گئی تھی۔ وہ سائیکالوجی کا بہترین استاد تھا اور اپنے مضمون پر اس کی گرفت کمال تھی۔ اس کی گریس فل پرسنالٹی نے لڑکیوں کو ایک طرف لڑکوں تک کو سحر میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ بولتا تھا تو دلائل سے پُر گفتگو مقابل کو لاجواب کر دیتی اور جب خاموش ہوتا تو اس کی ذہانت سے پُر آنکھیں سرگوشیاں کرتیں۔ اساتذہ میں اس کا ایک مقام تھا۔ وہ سینئرز کے لیے فخر اور جونیئرز کے لیے موٹیویشن تھا۔ چھوٹی سی عمر میں وہ جس پوسٹ پر تھا یہ اسے تھالی میں نہیں ملی تھی۔ اس کی دن رات کی محنت اور مضبوط قوتِ ارادی کا اس میں مکمل دخل تھا۔

اسٹاف روم میں موجود اسٹاف سے علیک سلیک کر کے، اپنے لاکر سے ضروری اشیا ہاتھ میں لیے وہ چہرے پر مسکراہٹ سجائے سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ کی جانب بڑھ گیا۔ اگلے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے وہ مسلسل مصروف تھا کیونکہ اوپر تلے اس کے لیکچرز تھے اور وہ کبھی اکتاتا نہیں تھا۔ پڑھانا اسے دنیا کی سب سے فرحت بخش خدمت لگتی تھی۔

☆☆☆

کہنے کو آٹھ سال تھے لیکن یہ ایک طویل عرصہ تھا جس میں اس نے دن رات ایک کیے رکھے۔ آٹھ سال پہلے جب وہ اپنی قوتِ ارادی کے بل پر مردہ تن لیے کھڑا ہوا تھا تو وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا آئندہ لائحہ عمل کیا ہوگا۔ میرٹ ہونے کے باوجود میڈیکل کالج میں داخلہ نہ لینے کا فیصلہ اس نے کس دل سے کیا تھا، یہ وہ جانتا تھا یا رب جانتا تھا۔ لیکن جس رات اس نے اپنے والد کو عندیہ دیا تھا کہ میڈیکل نہیں کرے گا تو اس کے ذہن میں مستقبل کے حوالے سے کوئی پلانز نہیں تھے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ جو وہ کر سکا کرے گا لیکن کچھ ایسا جو خضر کی انا کو ٹھیس نہ پہنچائے۔ کچھ اتنا خاص نہ ہو کہ خضر دوبارہ اس کی راہ میں روڑے اٹکائے اس لیے اس نے فارم بھرتے ہوئے بنا سوچے سمجھے انگلش لٹریچر اور سائیکالوجی لکھ دیا تھا۔ ان دونوں مضامین میں اس کا رتی برابر انٹرسٹ نہیں تھا لیکن امی اور خضر خوش تھے کیونکہ خضر کو یقین تھا کہ وہ کبھی بھی ان چاہے مضامین میں اچھے مارکس نہیں لے سکے گا۔ گھر میں اس کی پڑھائی کی وجہ سے جو تناؤ بھری کیفیت تھی جیسے شانتی میں بدل گئی۔ خضر نے بی ایس سی آنرز میں ایڈمشن لے لیا تھا۔ اس کا میتھس اچھا تھا اور پھر خاندان بھر میں اس کی جتنی عزت خراب ہو چکی تھی، اس نے سوچا کہ ایسے ٹف سبجیکٹ کو رکھ کر وہ کزنز میں دوبارہ دھاک بٹھا سکتا ہے گو کہ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ جو ایک بے جا کا رعب تھا اس کا، اس میں بتدریج کمی آتی گئی تھی اور زین کی اچھی عادات کا تذکرہ زبان زدِ عام ہونے لگا تھا۔ کئی رشتے دار حسد سے تو کچھ رشک سے اور چند فخر سے اس کا نام لیتے تھے۔ ننھیال میں وہ اب بھی نہ پسند کیے جانے والا لڑکا تھا لیکن اب اسے پروا نہیں تھی۔ وہ بہت عرصہ ہوا رشتے داروں سے ملنا ملانا ترک کر چکا تھا سوائے توقیر چاچو کی فیملی کے۔ باقی سب سے اس کی واجبی سی ہائے ہیلو تھی۔ کالج لائف کی ایک مخصوص بھاگ دوڑ اور جدوجہد کا دور اس نے ڈوبتی ابھرتی ناؤ کے مانند گزارہ جب تک کہ اسے "سر عبدالجبار" کی چھتر چھایا میسر نہیں آ گئی۔ اس کے سایہ سے بجیکٹس نے جہاں خضر کے دل کو چین میسر کیا تھا وہیں اکبر صاحب کو بے حد تکلیف دی تھی لیکن وہ ... بے بس تھے۔ انہیں اپنا آپ زین کا مجرم لگتا تھا اور زین ان کے رویے سے شرمندہ ہوتا رہتا تھا حالانکہ وہ اپنے کسی انداز سے انہیں محسوس نہیں کرواتا تھا کہ وہ دکھی ہے۔ اس کے پاس میڈیکل سے متعلق کتابیں ہوا کرتی تھیں جو اب کارٹن میں بند چھت پر بنے اسٹور میں پڑی تھیں۔ ایسی کوئی چیز اب اس کے کمرے میں موجود نہیں تھی جسے دیکھ کے اس کے اندر ڈاکٹر نہ بن سکنے کا ملال ... جاگتا۔ محض ایک درخواست جو اس نے باپ سے کی تھی اور اتھارٹیز (امی اور خضر) نے اسے اپروو بھی کر دیا تھا وہ یہ کہ اس کا اور خضر کا کالج ایک نہیں ہوگا۔ اور وہ دوسرے کالج میں چلا گیا تھا۔ یہاں سے اس کی زندگی نے نیا رخ لیا تھا۔ اس کے اندر جمی کثافت جو دھیرے، دھیرے بڑھتے، بڑھتے اس کی لگن اور شوق کو منجمد کرنے والی تھی، اسے سر عبدالجبار نے اپنی توجہ کا

www.dailyurdubooks.com
URDUBooks

پانی دیا۔ اس کے اندر جدو جہد کی نئی جہتیں کھوجنے کا شوق پیدا کیا۔ وہ جو سوچتا تھا کہ وہ اگر ڈاکٹر نہ بن سکا تو کچھ بھی نہیں بنے گا، اس کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ ایک ڈاکٹر نہ بن کے بہت کچھ بن سکتا ہے۔ تھرڈ ائیر کے آغاز تک وہ بلینک تھا۔ روٹین میں کالج جاتا اور واپس آجاتا۔ تھسن سائیکیٹرز کے دوران بیٹھا رہتا۔ سر عبد الجبار نے اس کی خاموشی سے زیادہ اس کے پتھریلے اور سپاٹ تاثرات کو نوٹس کیا تھا۔ وہ سائیکالوجی کے استاد تھے۔ چہرے پڑھنا ان کا شوق ہی نہیں مضمون کی مجبوری بھی تھی۔ وہ کم و بیش ہزاروں طلبا کو پڑھا چکے تھے اور انہیں کئی طلبا اب بھی یاد تھے جن کو انہوں نے نفسیاتی گرداب سے نکالا تھا۔ یہ کام وہ سعادت سمجھتے تھے۔ وہ کسی بھی طالب علم کی ذہنی ابتری کو اس کی پوری شخصیت کی خرابی کی بنیاد سمجھتے تھے اور زین اکبر میں انہیں ایسی ہی خرابی صاف دکھائی دی تھی۔ چند دن انہوں نے اسے ٹٹولا تھا، نگاہوں سے باتوں سے اور پھر اس کے قدم سے قدم ملا لیے۔

وہ سر جھکائے لائبریری جا رہا تھا جب..... سر عبد الجبار بھی خاموشی سے بنا چاپ اس کے پیچھے چلتے گئے۔ زین ایک کرسی کھینچ کر کہنیاں ٹیبل پر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ سر عبد الجبار اس سے کچھ فاصلے پر ٹیبل پر رکھا میگزین پڑھنے کے بہانے بیٹھ گئے تھے۔ میگزین کی آڑ سے انہوں نے زین کو دیکھا تو وہ یک ٹک سامنے سائنس اور میڈیکل سے متعلق کتابوں سے بھرے شیلف کو دیکھ رہا تھا۔ سائنس، میڈیسن، ڈسکوریز اور دیگر اسی فیلڈ کی کتابیں۔

سر عبد الجبار کی آنکھوں میں حیرت اتری اور پھر جیسے وہ زین کے ذہن کی تہ میں اتر گئے۔ وہ جگہ سے اٹھے اور میگزین ہاتھ میں لیے اس کے مقابل چیئر گھسیٹ کے بیٹھ گئے۔ وہ ادباً کھڑا ہو گیا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے واپس بیٹھنے کا کہا۔ زین.... بے آرامی محسوس کرتا بیٹھ چکا تھا۔ دکھاوے کو اس نے بیگ میں سے سائیکالوجی کی کتاب نکالی اور اس پر نظر دوڑانے لگا۔ وہ اسے زیرک نگاہی سے مسلسل دیکھ رہے تھے اور زین کو ان کی نگاہیں کسمسانے پر مجبور کر رہی تھیں۔

''کتاب الٹی ہے بیٹا۔ الٹی کتابیں سمجھ نہیں آتیں جیسے میلان سے ہٹ کے کچھ پڑھنا عام طور پر فائدہ نہیں دیتا۔ کیا خیال ہے؟''

سر عبد الجبار نے مسکراتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ زین نے کھسیاتے ہوئے فوراً کتاب کو سیدھا کیا۔ وہ یہاں سے جانے کے لیے پر تولنے لگا۔ سر نے اندازہ لگاتے ہوئے اسے پہلے ہی ٹوک کے راہ مسدود کر دی۔

''سکون سے بیٹھے رہو زین۔ استاد اور طالب علم کے درمیان ادب کی آخری حد قائم رہنی چاہیے بس، اس سے پہلے جو ہے وہ سب مباحثے کے لیے ہے، ڈسکس کرنے کے لیے ہے علم اور سیکھ دینے کے لیے ہے۔ تم مجھ سے علم حاصل کرتے ہو تو میں بھی تم سے کچھ سیکھنا چاہتا ہوں۔ سکھاؤ گے کیا؟''

''م..... مم۔ میں بھلا کیا سکھاؤں گا سر آپ کو۔ میں تو خود ابھی پڑھ رہا ہوں۔ مجھے تو خود ابھی کچھ نہیں آتا۔''

''یہی سکھاؤ ناں مجھے۔ کہ ان چاہا کیسے پڑھتے ہیں۔ بنا دلچسپی کے علم کیسے حاصل کیا جاتا ہے۔'' سر عبد الجبار نے اس کی درست رگ کو یک دم ہی پکڑ لیا تھا۔ زین ششدر سا ان کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ سر مسکرائے اور کمر ٹیک کے تسلی سے بیٹھ گئے۔

''ڈاکٹر بننا چاہتے تھے زین؟'' انہوں نے نرمی اور ملاحت سے پوچھا۔ ''بولو۔ بتاؤ ناں؟''

زین انہیں انکار نہیں کر سکا۔ سر اثبات میں ہلا کے جھکا لیا۔

''اور بن نہیں سکے۔ ہیں ناں۔ اسی لیے جو پڑھ رہے ہو اس میں دلچسپی بھی نہیں اور جو پڑھنا چاہتے تھے وہ یقیناً کسی مجبوری کی بنا پر پڑھ نہیں پائے۔ تو کیا ایسے ہی وقت گزار لو گے؟''

''معلوم نہیں۔'' زین کی مردہ سی آواز کچھ پل بعد حلق سے نکلی۔

''نہیں۔ ایسا نہیں ہوتا زین۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ کرنا بھی ہے کہ نہیں کرنا۔ اگر تمہیں پڑھنا ہے تو تم پڑھو گے بھلے سے کیسے بھی حالات

www.dailyurdubooks.com

ہوں اور اگر نہیں، پڑھنا تو تم لازمی ناکام ہی رہو گے۔ تو اب بتاؤ کیا کوئی اور آپشن ہے تمہارے پاس؟'' سر عبدالجبار ۔۔۔۔ نے جھک کے سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ زین کو لگا جیسے وہ مسمرائز ہو رہا ہے۔ سر کی باتوں نے اس کا دماغ جکڑ لیا ہے۔ وہ انہیں جواب دینا نہیں چاہتا تھا لیکن دینے پر مجبور تھا۔

''آپشن مجھے کبھی دیا ہی نہیں گیا سر۔ چوز کرنا کیا ہوتا ہے؟ کیسا لگتا ہے؟ من مرضی کیا ہوتی ہے اور مرضی کرنا کیسی خوشی دیتا ہے، مجھے نہیں معلوم۔ اس لیے آپشن کا میرے پاس کوئی جواز نہیں۔ میں بس پڑھوں گا اور یہی پڑھوں گا جب تک کہ مجھے روک نہ لیا گیا۔''

''اور روکا کیوں جائے گا بھلا؟''

وہ بول رہا تھا تو وہ چاہتے تھے کہ بولتا چلا جائے۔

''کیونکہ یہ سب جب میری چوائس بن جائے گا تو اسے اسٹاپ لگا دیا جائے گا۔ جب تک میں اوپری دل سے پڑھوں گا، اچھے مارکس اسکور نہیں کروں گا تب تک ان سب کو میرے ساتھ نتھی رہنے دیا جائے گا، اس لیے مجھے کچھ بھی نہیں پڑھنا بس وقت گزارنا ہے۔''

زین کی آواز بھیگ گئی۔ سر عبدالجبار نے بظاہر۔۔۔۔ بے حد سکون سے اس کی بات سنی تھی جبکہ وہ اندر سے سن ہو گئے تھے۔ زین کا کیس ان کی توقع سے کچھ ہٹے ہوئے ٹریک پر تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ اس کے گھر کا ماحول یا اس سے جڑے افراد اس کی خواہشات کے آڑے آئے ہیں اور آتے ہیں۔ اس کی زبان سے نکلا غبار اس کے دل پر جمی کثافت تھا اور اس میں ہلچل ہو گئی تھی۔

''تمہیں پتا ہے زین میں پائلٹ بننا چاہتا تھا۔ زووم۔ ایسے جہاز اڑانا چاہتا تھا میں۔'' وہ ہتھیلی کو ہوا میں لہرا کے جہاز کی طرح اڑاتے ہوئے بولے۔ زین نے حیرت زدہ نم آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

''لیکن پھر ایک ایسا حادثہ ہوا جس نے میری زندگی کا رخ موڑ کر رکھ دیا۔ میں بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا۔ یہاں تک کہ ایک بار میں نے خودکشی کی کوشش بھی کی۔''

''کیوں، ایسا کیا ہوا تھا آپ کے ساتھ؟'' زین نے انہیں بغور دیکھا جیسے وہ مذاق کر رہے ہوں۔ سر عبدالجبار ۔۔۔۔ مسکرائے اور اردگرد بنظرِ غائر دیکھ کر انہوں نے اپنی دائیں ٹانگ پھیلائی اور پینٹ کا پائنچا اوپر تک کھینچ کے زین کو دیکھنے کا اشارہ کیا۔ زین نے ناسمجھی سے نگاہ ڈالی تو شاکڈ رہ گیا۔ سر کی وہ ٹانگ نقلی تھی۔ گھٹنے تک۔ بالکل نقلی۔ اسے شدید دھچکا لگا تھا۔ ایسا منظر وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ سر عبدالجبار اس کے تاثرات کا مزہ لیتے ہوئے پائنچا نیچے کر کے سیدھے ہوئے اور بولے۔

''میں اپنے خوابوں کے ساتھ بہت اونچا اڑ رہا تھا۔ کچھ ہی دن میں، میں ایئر فورس جی ڈی پی کے لیے اپلائی کرنے والا تھا۔ ہر دم ایکسائٹڈ اور پُرجوش رہا کرتا تھا۔ میری امی کی دوائی ختم ہو گئی تھی۔ محلے کے میڈیکل اسٹور سے پتا کی لیکن نہیں ملی تو بائیک لے کر نکل گیا۔ جہاں سے دوائی لانی تھی وہاں راستے میں پل آتا تھا۔ میں کچھ اوور اسپیڈ تھا یا میری قسمت خراب تھی کہ پل پر گریس آئل گرا ہوا تھا۔ اس پر سے میری بائیک سلپ ہوئی اور میں پوری طاقت سے گرنے کے بعد ٹائر کی طرح اچھل کر پل سے نیچے جا گرا۔ نیچے کس چیز پر گرایا، نہیں سوائے اس کے کہ میری ٹانگ مجھے ایسا لگا کہ چیتھڑوں میں بٹ گئی تھی۔ کہاں کہاں چوٹ آئی، سب، کو ٹانگ، میں ہونے والی شدید تکلیف نے بھلا ڈالا۔ جب اسپتال میں ہوش آیا تو میری ٹانگ کٹ چکی تھی۔ پورا اسپتال میری چیخوں سے گونجتا رہا اور میرے گھر والے مجھے سنبھالنے میں ہلکان ہوتے رہے۔ اس کے بعد مجھے لگا جیسے میرے لیے زندگی ختم ہو گئی ہے۔ مجھے زندہ رہ کر اب کرنا ہی کیا ہے۔ میں گھر کی چھت پر چڑھا اور پشت کے بل بنا نیچے دیکھے پیچھے کو الٹ گیا۔ میری ماں کی دعائیں تھیں جنہوں نے مجھے حرام موت مرنے سے بچا لیا اور میں سیدھا والدہ کی ڈھیر کی ہوئی گندم پر جا گرا جس پر گرنے سے مجھے چوٹیں تو ضرور آئیں لیکن کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا۔ میری والدہ میری اس حرکت سے بہت دلبرداشتہ ہوئیں اور بلک بلک کر روتی رہیں۔ اس دن کے بعد سے وہ میرا سایہ بن گئیں۔ انہوں نے میرے ساتھ خود

www.dailyurdubooks.com
URDU BOOKS

کو جوڑ لیا۔ دن رات میری خدمت سے اور دلجوئی میں انہوں نے اپنا وقت صرف کرنا شروع کر دیا۔ میں خود کو سنبھالنے کے معاملے میں بے بس تھا لیکن والدہ نے بڑی محبت سے میری برین واشنگ کرنا شروع کی۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں مگر میری رگ، رگ سے واقف تھیں۔ انہیں میری کمزوری اور طاقت دونوں پر پکڑ تھی۔ اور پھر انہوں نے میری کمزوری کو طاقت میں ڈھالنا شروع کیا۔ وہ صبح، صبح مجھے پارک میں لے جانے لگیں جہاں مجھ سے باتیں کرتیں وہ آتے جاتے لوگوں کو مجھے دکھا کر پوچھا کرتیں۔

''تمہیں کیا لگتا ہے عبدالجبار کہ وہ جو آدمی اتنے اچھے حلیے میں درخت کے نیچے بیٹھا مسلسل سگریٹ پی رہا ہے وہ یقیناً بیوی سے لڑ کر نکلا ہے۔ دیکھو تو کیسے ادھ پی سگریٹ مسل کر پھینک دیتا ہے اور اگلی جلا لیتا ہے۔ یہ بیوی کا غصہ ہے جو سگرٹوں پر نکل رہا ہے۔ کیا کہتے ہو؟''

وہ سمجھ کے مطابق جواز دیتیں اور میں بے اختیار اپنی رائے دیتا۔

''نہیں امی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے نہ کوئی دفتری مسئلہ ہو۔ کاروباری ٹینشن ہو۔ دیکھیں ناں اتنا سوٹڈ بوٹڈ سا پارک میں آ کر بیٹھا ہوا ہے بجائے اس کے کہ آفس میں ہوتا تو شاید کوئی آفس سے متعلق مسئلہ ہوگا۔''

امی مجھے معنی خیزی سے دیکھ کر ہنکارا بھرتیں۔

''اچھا وہ جو دو عورتیں آ رہی ہیں برے، برے منہ بنا کر باتیں کرتی۔ وہ تو یقیناً شوہروں کی برائی کر رہی ہیں۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے ناں بہوؤں سے بیزار ہوں۔'' میں ہنس کے بولا۔ ''دونوں جس عمر کی ہیں یقیناً ساس بن چکی ہوں گی تو اس عمر میں عورتوں کے رونے میاں کی برائیوں سے بہوؤں کے عیبوں تک کا سفر کر لیتے ہیں۔''

''ہوں، تمہیں کیسے پتا کہ تم صحیح کہہ رہے ہو یا میں؟''

''مجھے یہ نہیں پتا۔ بس میرا تجزیہ ہے۔ چہرے کے تاثرات بولتے ہیں امی اور میں نے بس تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بات کہی ہے۔ ہو سکتا ہے، میں نہیں آپ ٹھیک ہوں۔''

میں اپنی دُھن میں بولتا جا رہا تھا اور امی مجھے بغور دیکھتے ہوئے انہماک سے سن رہی تھیں۔ جب میں خاموش ہوا تو انہوں نے محبت سے میرا ہاتھ تھاما اور بولیں۔

''عبدالجبار، تم چہرے پڑھا کرو۔ جب ایسا کرو گے تو تمہیں اپنی زندگی سے پیار ہو جائے گا کیونکہ دوسروں کے چہرے ان کا غم اور دکھ بتائیں گے اور جب تم ان دکھوں کو پڑھو گے تو اپنے دکھ ہلکے لگیں گے۔ تم اوروں کی دلجوئی کا سامان بن سکتے ہو۔ تم دوسروں کو خوش کرنے کی جستجو میں لگ جاؤ گے۔ پھر تمہیں پتا چلے گا کہ زندگی کتنی پیاری ہے۔ یہ محض ایک ٹانگ کٹ جانے سے ختم نہیں ہو سکتی۔ بلکہ تمہیں اپنے نامکمل وجود کا استعمال مثبت انداز میں کرنا چاہیے۔ آج تمہاری ماں اگر تمہاری سوچ بدلنے میں کامیاب ہو گئی تو کل کو تم کسی اور عبدالجبار کو زندگی کی جانب لا سکتے ہو۔ امنگوں کو جگا سکتے ہو، حوصلوں کو بڑھا سکتے ہو۔ بس اپنے دکھوں پر رونے سے پہلے دوسروں کے دکھ ٹٹول لو۔''

امی کی باتیں ایک نئی سوچ بن کر میرے دل و دماغ میں کلبلانے لگیں۔ میں مایوسی کے عالم میں انہیں دبانے کی کوشش کرتا کیونکہ میں اپنے صدمے کو سینے سے لگائے رکھنا چاہتا تھا۔ میں ابھرنا نہیں ڈوب جانا چاہتا تھا لیکن امی میرا سایہ بن گئیں۔ انہوں نے دن رات میرے لیے وقف کر دیے اور اس انداز سے میرا مزاج قابو کیا کہ میں مجبور ہو گیا اپنی زندگی کا نئے سرے سے آغاز کروں۔ اپنا مقصد بدلوں، اپنا نظریہ بدلوں۔''

زین بے حد انہماک سے سر عبدالجبار کی داستان سن رہا تھا جیسے اس کے سر پر کبوتر بیٹھا ہو۔ سر نے اس کے سامنے ٹیبل پر انگلی سے گویا ٹھک، ٹھک کیا اور بولے۔

''کچھ سمجھ آیا آپ کو جناب اس تمام سرگزشت کا لب لباب؟''

''جی، آیا۔ وہ یہ کہ آپ کی ناکامی کو کامیابی میں بدلنے والے پل کا نام ''ماں'' ہے۔ لیکن بدقسمتی سے سر میرے پاس یہ رشتہ تو ہے لیکن میری ماں کو میری ناکامی یا کامیابی سے کوئی غرض نہیں۔''

www.dailyurdubooks.com
URDUBooks

سر عبدالجبار کو اس سے کسی ایسے ہی جواب کی امید تھی۔ اس لیے وہ کھل کر مسکرائے اور بولے۔

''ماں نہ سہی۔ کوئی تو ہوگا ناں جسے تمہاری کامیابی خوش کرتی ہوگی اور ناکامی دکھ دیتی ہوگی۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ہمیں کوئی پیار کرنے والا نہ ہو۔ بات محض اتنی ہوتی ہے کہ ہم گردن اٹھائے اِدھر اُدھر نگاہ گھماتے اپنے حصے کی محبت ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں جبکہ وہ سر نہیوڑائے ہماری جھولی میں پڑی ہوتی ہے۔ تمہاری زندگی میں بھی کوئی نہ کوئی تو لازمی ہوگا زین جسے تم سے پیار ہوگا۔''

اور زین کے تصور میں خود سے گلے لگ کے روتا باپ اور دروازے کے پیچھے چھپ کر اس کی خاطر آنسو بہاتی زویا آ گئی۔ وہ خفیف سا ہو کر سر جھکا گیا لیکن جواب میں بولا کچھ نہیں۔ اور پھر اس دن کے بعد سے سر عبدالجبار نے جیسے اس کا پیچھا لے لیا۔ اسے اپنی کلاس میں انوالو رکھنے کے لیے انہوں نے ہر حربہ آزمایا اور بالآخر وہ کامیاب ہو گئے۔ زین کی توجہ ایک بار پھر پڑھائی کی جانب مبذول ہونے لگی۔ وہ مظلومیت کے خول کو چٹخانے میں کامیاب ہوتا چلا گیا۔ سر عبدالجبار نے اس کا اپنی ذات پر اعتماد بحال کیا۔ زین جو ایک بار پھر اپنے بچپن کے فیز میں لوٹ چکا تھا جب وہ خضر کے خوف میں مبتلا رہا کرتا تھا، اس سے ابھر کر اب گھر میں کھل کر سانس لینے لگا تھا۔ وقت پلٹ نہیں سکتا تھا، وہ ڈاکٹر نہیں بن سکتا تھا لیکن جو وہ بن سکتا تھا اس کے لیے کوشش کرنا اس کے ہاتھ میں تھا اور اس نے اپنی جان لڑا دی۔ خضر آڑے آیا یا امی نے ڈپٹا، ابن نے آنے والے کئی سالوں تک کانوں میں تیل ڈال لیا۔ اکبر صاحب اس کے اندر آنے والی اس تبدیلی سے بے حد مطمئن تھے اور اس کی مکمل پشت پناہی کرنے لگے۔

''کبھی، کبھی انسان کو کھڑا ہونے کے لیے کسی دوسرے کے سہارے کی نہیں اندرونی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کھڑے کے ساتھ پھر دو اور کھڑے ہو ہی جاتے ہیں۔ اٹھے قدم کے ساتھ کسی کے قدم مل ہی جاتے ہیں۔''

زین نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس نے شاندار نمبروں سے بی ایس سی کیا اور پھر سائیکالوجی میں... ایم ایس سی کرنے کے بعد ایم فل میں داخلہ لیا تو خاندان بھر میں اس کے نام کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ ہر چھوٹا بڑا اس کی مثالیں دیتا، لڑکیوں کی ماؤں نے اس سے التفات دکھانا شروع کر دیا۔ سعدیہ کے لیے یہ صورتِ حال عجیب تر تھی۔ وہ زین کو ٹوک پاتیں نہ روک سکتی تھیں لہٰذا اس کی کامیابیوں کا سہرا اپنے سر پر سجانا شروع کر دیا۔ ہر ایک کے منہ سے نکلتے تعریفی کلمات کے تمغے اپنے سینے پر سجانے شروع کر دیے اور زین کو اس سے بھی مسرت ہی حاصل ہوتی تھی۔ وہ اپنی ماں کے لیے فخر کا سبب بنتا اس سے بڑی خوشی اسے بھلا کیا مل سکتی تھی۔ اکبر صاحب کے لیے وہ قابلِ فخر بیٹا بن گیا تھا۔ خضر کی حالت دیدنی تھی۔ وہ بے حد گھسٹ گھسٹ کے ایم بی اے کر پایا تھا اور ہنوز نوکری کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ ملتی تھی تو اس کے ناک پر نہ بیٹھتی اور جیسی چاہیے تھی وہ ملتی نہ تھی۔ زین کو دیکھتا تو دماغ کی کھولن سوا ہو جاتی۔ وہ جتنا زیادہ زین کو نیچا دکھیل سکتا تھا اس نے دھکیلا تھا۔ یہ کرتے، کرتے وہ بچے سے بڑا ہوا تھا اور اس اونچ نیچ کے چکر میں وہ خود اخلاقی پستیوں میں جا گرا تھا۔ بچپن میں اس نے زین کو کبھی اونچ نیچ کا پہاڑ کھیلنے نہیں دیا تھا۔ زین اونچ پر کبھی نہ چڑھ پائے اس میں اس کی نفسیاتی تسکین تھی۔ لیکن وقت ہولے، ہولے بازی پلٹ رہا تھا۔ ایک کھیل پر تو وہ کنٹرول رکھ سکتا تھا لیکن وہ کھیل جو قسمتیں کھیلتی ہیں، اس کے اختیار سے باہر تھا۔ وہ چھوٹے، چھوٹے میدانوں میں زین کو پچھاڑتا رہا اور زین بڑے محاذ پر سبقت لے گیا۔ اس نے زین کو ڈاکٹر نہ بننے دیا کہ اس طرح وہ ہر طرف چھا جائے گا لیکن زین جس لائن میں چلا گیا وہاں ابھی سے اس کی شہرت پھیل رہی تھی۔ اسے کالجز اور بڑے اداروں سے جاب کی آفرز شروع ہو چکی تھیں۔ ایم فل مکمل کرنے تک اس نے جاب بھی کی تاکہ اپنا تمام خرچ خود اٹھا سکے۔ اور جس دن شہر کے بہترین کالج میں اس کی بطور اسسٹنٹ پروفیسر تقرری ہوئی اس دن

www.dailyurdubooks.com

خضر نے اپنے کمرے کی ہر چیز الٹا کے رکھ دی تھی۔ سعدیہ اپنے لاڈلے کی حالت کے پیشِ نظر سر پر دوپٹا باندھ کر کروٹ لیے لیٹ گئی تھیں کہ زین کی خوشی میں خوش ہوتا دیکھ کر خضر سہمہ نہیں پائے گا اور مزید دلبرداشتہ ہوگا۔ اکبر صاحب نے نئی نکور گاڑی کی چابی زین کے حوالے کی تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ماضی اس کی پشت پر بھلے اذیتیں داغ گیا تھا لیکن اس کے حال نے اس کی چھاتی پر سنہری تمغے سجا دیے تھے۔

اس رات خضر کمرے میں کرسی پر جھولتا پل، پل سلگتا رہا تھا۔ حسد کرنے والے کا حال اس بچھو کی طرح ہے جس کے اردگرد آگ لگا دو تو وہ خود کو ہی ڈنک مار مار کے اپنا خاتمہ کر لیتا ہے۔

☆☆☆

روزانہ کی طرح وہ بہت سویرے جاگ گیا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد قرآن پڑھنے کی عادت اسے دادی نے ڈالی تھی لیکن ان کی وفات کے بعد اس میں وقفہ آ گیا اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ دوبارہ سے خود کو منظم کرنے میں کامیاب ہوا تو اس نے سب سے پہلے نماز کو لازم کر لیا۔ جب اسے سننے والا کوئی نہ ہوتا تو اس وقت اس کے لیے نماز ہی جذباتی اور روحانی سہارے کا کام کرتی تھی۔

اس نے قرآن پاک رحل میں رکھا اور اٹھ کر کھڑکی کے قریب چلا آیا۔ باہر ہلکی، ہلکی ہوا کے ہلکورے تھے اور پل، پل تیز ہوتی روشنی۔ یہ منظر دیکھنا اسے اچھا لگتا تھا، یوں محسوس ہوتا جیسے تمام دن خوب صورت گزر جائے گا۔ اس نے کھڑکی کے پٹ مکمل کھول کر تھوڑی سی گردن باہر نکالی تو ایک طرف لان چیئر پر ابو بیٹھے دکھائی دیے۔ وہ مسکرا دیا۔ روز کی طرح وہ اس سے پہلے وہاں موجود تھے۔ وہ بالوں میں انگلیاں چلاتا باہر چلا آیا۔ ابو اسے دیکھ کر مسکرائے اور ہاتھ میں تھاما باسی اخبار ٹیبل پر رکھ کر اسے شفقت سے دیکھنے لگے۔ وہ سلام کرتا دوسری کرسی پر ادب سے بیٹھ گیا۔

''ابو تھوڑی بہت واک شاک کیا کریں اس وقت۔ یہیں لان میں ہی۔ ڈاکٹر نے تنبیہ کی تھی آپ کو۔ لاسٹ چیک اپ میں آپ کا کولیسٹرول لیول بہت ہائی تھا۔ خیال رکھیں اپنا۔'' وہ گھٹنوں پر دونوں کہنیاں ٹکا کر تھوڑا آگے کو جھک کر اکبر صاحب سے مخاطب ہوا۔ جواب میں وہ دونوں آنکھیں میچ کر مزاقاً گویا ہوئے۔

''کیا کرنا ہے اب خیال رکھ کے۔ عمر گزر گئی۔ اب تو بونس پر گزرنی ہے بیٹا۔''

''ایسا نہیں کہتے۔ اللہ آپ کو لمبی عمر دے۔ اور بونس کیوں بھلا۔ بڑے بھائی لگتے ہیں میرے۔ ابھی تو ہم دونوں کو مل کر دنیا دیکھنی ہے۔ بس میں اور آپ۔'' وہ اپنائیت سے باپ کا ہاتھ تھامے کہہ رہا تھا اور اکبر صاحب کی آنکھیں بیٹے کی محبت پر جھلملا گئیں۔ انہیں یاد نہیں تھی کوئی ایک بھی نیکی لیکن زین ان کی کسی نیکی کا اجر تھا یا پھر ان کی ماں کی دعا۔

''کالج کے لیے کب تک نکلنا ہے تم نے؟'' انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکال کر چشمے کے پیچھے سے اپنی گیلی آنکھوں کو مسلا اور پوچھا۔ زین نے چہرہ اونچا کر کے آسمان پر نگاہ دوڑائی اور پُرسوچ لہجے میں بولا۔

''ہم.....م۔ آج تو دیر سے جاؤں گا۔ پہلا لیکچر دس بجے کے بعد ہے بس اسی وقت لگ بھگ۔''

''تو پھر مجھے بھی چھوڑ دینا راستے میں عارف کی طرف۔ بڑے دن ہو گئے اس سے گپ شپ کیے۔ دوپہر وہیں لگاؤں گا میں۔ شام کو اتار جائے گا مجھے۔'' انہوں نے اپنے دوست کا نام لیتے ہوئے تفصیل سے کہا تو زین بھویں اچکا تا بولا۔

''امی کو برا لگے گا ابو۔ آپ کو پتا ہے ناں انہیں انکل عارف نہیں پسند۔ اور آپ پورا دن گزارنا چاہ رہے ہیں۔ بدمزگی ہو جائے گی ابو۔''

''انہیں پسند ہی کون ہے بیٹا۔ سوائے اپنے لاڈلے کے۔ چھوڑ واسے۔ جو کہا ہے وہ کرو نہیں تو چلا جاؤں گا خود ہی میں۔'' وہ نروٹھے لہجے میں بولے تو زین نے جھٹ سے ان کا گھٹنا تھاما۔

''جی نہیں..... میں ہی چھوڑ دوں گا آپ کو۔

www.dailyurdubooks.com

ناراض نہ ہوں۔ میں نے بس ویسے ہی کہا تھا۔ آئیں ناشتا واشتا کرتے ہیں... مل کر پھر نکل چلیں گے دونوں باپ، بیٹا۔ پکا۔'' وہ ہلکی سی آنکھ دباتا ہوا ان سے کہہ رہا تھا۔ اکبر صاحب کو اس پر بہت پیار آیا۔ جب سے نوکری کرنے لگا تھا اس نے لاشعوری طور پر ماں باپ کو لاڈلی اولاد کی طرح ٹریٹ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ناز اٹھانا۔ بات زد نہ کرنا۔ من پسند چیزیں لانا۔ اور دونوں سے اظہار میں کوئی ''فرق'' نہ کرنا۔ بنا کسی صلے کے وہ اسی روٹین پر چل رہا تھا۔ اکبر صاحب کو صحیح معنوں میں اس پر فخر تھا۔

☆☆☆

صبح کے ساڑھے آٹھ کا وقت تھا اور سعدیہ کسی گہری سوچ میں گم ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی تھیں۔ ملازمہ ایک، ایک کر کے ناشتے کے لوازمات میز پر سجا رہی تھی۔ یہ کل وقتی ملازمہ زین نے خاص ماں کے لیے رکھوائی تھی اور انہیں اس کی وجہ سے بہت آرام تھا۔ زویا کالج جا چکی تھی اور اکبر صاحب خاموشی سے تازہ اخبار ایک ہاتھ میں تھامے دوسرے سے سلائس میں آملیٹ رکھے کھا رہے تھے۔ سعدیہ ہر کچھ دیر میں انہیں گھورتیں اور پھر کچھ کہتے، کہتے چپ کی چپ رہ جاتیں۔ اکبر صاحب جانتے تھے کہ ان کے اندر کیا چل رہا ہے لیکن وہ انہیں جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں زین نک سک سے تیار وہاں چلا آیا۔ آف وائٹ فارمل شرٹ کے ساتھ بلیک ڈریس پینٹ پہنے وہ مکمل رعب داب کے ساتھ کالج جانے کے لیے تیار تھا۔ سعدیہ نے فطری محبت سے بیٹے کو دیکھا۔ وہ ان کا فرمانبردار بیٹا تھا۔ ان کی ہر، ہر بات مانتا تھا۔ اپنی پوری تنخواہ لا کر ان کی ہتھیلی پر رکھتا اور پھر اپنی ضرورت کے لیے پیسے ان سے مانگتا۔ انہیں بے حد عزت و احترام دیتا تھا۔ وہ اس سے محبت کرتی تھیں کیونکہ ان کی اولاد تھا لیکن یہ لیکن بھی آتا جب سامنے خضر آ جاتا۔ اس وقت بھی ان کی سوچوں میں جو کچھ چل رہا تھا اس میں بھی آمنے سامنے خضر اور زین ہی آ چکے تھے۔ اور لازمی امر تھا کہ وہ خضر کے لیے زین سے بہتر ہی سوچ رہی تھیں۔

زین ماں کو تفکر میں ڈوبا دیکھ کر پوچھے بنا نہیں رہ سکا۔

''امی کیا بات ہے۔ اتنی چپ کیوں ہیں، خیر تو ہے؟''

سلائس پر پر آملیٹ کا ٹکڑا رکھ کے اس نے اسے ایک فولڈ دیتے ہوئے پوچھا۔ اکبر صاحب نے زور سے اخبار کو جھٹکا۔ یہ اشارہ تھا کہ وہ زین کے سامنے خاموش رہیں، بعد میں بات ہو گی۔ سعدیہ سمجھتے ہوئے زبردستی مسکرائیں اور جواب دیا۔

''ہاں ٹھیک ہوں۔ بس خضر کی جاب کو لے کر پریشان ہوں۔ ایسی ہائی فائی ڈگری ہوتے ہوئے بھی میرا بچہ کھجل خوار ہو رہا ہے۔ نوکریاں تو جیسے اس سے دشمنی کیے بیٹھی ہیں۔ کوئی مل کر نہیں دیتی۔''

''مل جائے گی امی۔ میں نے کی ہے ایک دو اور لوگوں سے بات۔ جلدی بتائیں گے کچھ۔ فکر نہ کریں۔'' زین نے ماں کو سنجیدگی سے دیکھا اور مدبرانہ تسلی دی۔

''کیسے نہ کروں۔ وہ تمہیں دیکھ، دیکھ کر کڑھتا رہتا ہے بیٹا۔ اسے اپنی اعلیٰ ڈگری کا دکھ ستاتا رہتا ہے کہ آخر تمہارے سے زیادہ ویلیو ہے اس کے پڑھتے ہوئے کی لیکن بجائے اس کے کہ بڑا بھائی سیٹ ہو جاتا، ماشاءاللہ سے تم ہو گئے۔ اب خود سے چھوٹے کو دیکھ کر دکھی تو ہو گا ناں وہ۔''

زین نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اکبر صاحب بیچ میں کود پڑے۔

''کیوں دکھی ہو رہا ہے وہ۔ وہ اور اس کے دکھ ہونہہ..... دماغ میں خناس بھر رکھا ہے تم نے اس کے۔ زین نے دو نوکریاں لگوائی تھیں لیکن تمہارے لاڈلے کو وارا ہی نہیں کھاتا کچھ..... کبھی تنخواہ تو کبھی سیٹ۔ کبھی باس تو کبھی اسٹاف۔ وہ درحقیقت چپڑاسی کی نوکری کے لائق ہے۔ چار دن کرے ناں تو اوقات اور عقل جگہ پر پہنچ جائیں اور یہ کس نے کہہ دیا تم سے کہ اس نے زین سے اچھی ڈگری لی ہے۔ مرمر کے ایم بی اے کیا ہے اس نے اور زین ایم فل کر چکا ہے بیگم صاحبہ۔ اسسٹنٹ پروفیسر ہے وہ اور فارن انسٹیٹیوٹس سے آفرز

www.dailyurdubooks.com
URDU BOOKS DAILY

اسے ہیں، خضر کو نہیں۔ اب دوبارہ میرے سامنے خضر کے رونے مت رونا۔ سمجھیں!''

سعدیہ اور زین نے دم سادھ رکھے تھے۔ اکبر صاحب اب اکثر ایسے ہی غصے میں آجایا کرتے تھے اور یہ غصہ زیادہ تر خضر اور بیوی کے لیے ہی ہوا کرتا۔ زین کو ماں کا ستا چہرہ دیکھ کر شرمندگی نے گھیر لیا۔ اس نے جلدی سے ناشتا ختم کیا اور چائے کا کپ ہاتھ میں تھام کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ میں کمرے میں پی لیتا ہوں۔ چیزیں کلیکٹ کرلوں۔'' اس نے مگ کی جانب ابروؤں سے اشارہ کیا اور اکبر صاحب سے مخاطب ہوا۔

''ابو آپ تیار ہو جائیں۔ نکلتے ہیں تھوڑی دیر میں اور اتنا ہائپر ہونا آپ کی صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔''

اس کے نکلتے ہی اکبر صاحب نے شاکی نگاہوں سے بیوی کو دیکھا۔

''اشارہ کیا تھا ناں چپ رہنا۔ کیوں اسی کا دل ملا ہوا ہے تم دونوں ماں بیٹے کو دکھانے کے لیے؟''

''تو اصل مسئلہ کہاں بولا میں نے۔ وہ بات تو کوئی اور ہے۔'' سعدیہ نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے سکون سے کہا تو اکبر صاحب سلگ گئے۔

''واہ یعنی کہ ابھی چھری پھیرنی باقی تھی۔ پھیرو پھر۔''

سعدیہ نے کپ میز پر واپس رکھتے ہوئے ان کی جانب جھکتے ہوئے شروعات کی۔

''وہ آپ کو پتا ہے نا زنیرہ آرہی ہے اٹلی سے۔''

زنیرہ ان کی نند تھیں اور شادی کے بعد سے اٹلی میں مقیم تھیں۔ اکبر صاحب ان کی بات کے جواب میں استفہامیہ انہیں دیکھتے ہوئے بولے۔

''مجھ سے ہی پتا چلا ہے تمہیں اس کے آنے کا۔ اب مجھے کیوں بتا رہی ہو؟''

''اکبر، دیکھیں مجھے غلط مت سمجھیے گا۔'' سعدیہ نے ان کے ہاتھ کی پشت پر اپنا ہاتھ جمایا۔ ''آپ اس سے خضر کے لیے بات کریں ناں۔ دیکھیں ناں وہ بڑا ہے اور پھر پہلا نمبر اسی کا ہونا چاہیے۔ وہ پہلے ہی کافی زود رنج رہتا ہے اور ایسے میں اگر زین کے بارے میں جب اسے معلوم ہوگا تو اس کا دل زخمی ہو جائے گا۔ میرے لیے میری اولاد برابر ہے لیکن میں انصاف کی قائل ہوں اکبر۔ میں نہیں چاہتی کہ کل کو ہماری اولاد میں ان باتوں کو لے کر اختلاف ہو۔ اس لیے آپ خضر کی بات کریں۔ میں ناانصافی نہیں کرسکتی اکبر۔''

اکبر صاحب طیش سے کرسی پر سے گھسیٹتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''یہ بولو کہ تم بس خضر کے ساتھ ناانصافی نہیں کر سکتیں۔ کسی اور کے لیے تمہیں ترازو دکھائی ہی کہاں دیتا ہے۔ ایک بات، کہوں سعدیہ بیگم۔'' وہ دونوں ہتھیلیوں کے بل پر میز پر جھکے ''تمہارا یہ جنون خضر کو برباد کردے گا۔ تمہاری جنونی محبت اسے کہیں کا نہیں چھوڑے گی۔ لکھ لو میری بات۔ اور دوسری بات اگر زنیرہ نے زین کی لیے کہا ہے تو زین ہی کی بات ہوگی۔ اور اس بار بھلے سے خضر کچھ بھی کھا لے۔ بہت ہوا یہ تماشا۔'' وہ کہہ کر غصے میں وہاں سے نکلتے چلے گئے۔

''میں بھی دیکھتی ہوں میرے خضر کی خوشی کون چھینتا ہے۔ میری لاش پر سے گزرنا ہوگا سب کو۔''

سعدیہ نے تلخی سے بڑبڑا کے میز پر پڑا چائے کا کپ اٹھا کر پرچ میں زور سے پٹخا۔ کپ تڑخ گیا۔ قطرہ، قطرہ چائے کپ کی دراڑ سے رستی ہوئی پرچ میں جمع ہونے لگی۔

☆☆☆

دن کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ کمرے میں تیز میوزک اور دھواں مدغم ہو رہا تھا۔ کوئی شے جگہ ٹھکانے پر نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی یہاں کشتی ہوئی ہو لیکن ایسا کچھ نہیں تھا بلکہ یہ اس کمرے کی عمومی حالت تھی۔ دیواروں پر مرد ریسلرز کے پوسٹرز اور عورتوں کے نیم برہنہ پوسٹرز کمرے کے مالک کے ذوق کا پتا دیتے تھے۔ فرش پر جا بجا سگریٹ کے ٹوٹے پڑے تھے۔ اپنے بیڈ پر الٹی حالت میں لیٹا خضر اکبر ہمدانی کالے رنگ کی بنیان کے ساتھ گرے ڈھیلا سا ٹراؤزر پہنے ہوئے تھا۔ تبھی کمرے کا دروازہ کھلا اور سعدیہ اندر داخل ہوئیں۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ فوراً

www.dailyurdubooks.com
URDU DAILY BOOKS

ناک پر ہاتھ رکھ کر کھانسی تھیں۔ ایک نظر خضر کو دیکھ کر وہ کمرے کی کھڑکیوں کی جانب بڑھیں اور پردے ہٹا کر کھڑکیاں کھول دیں۔ ہوا کے تازہ جھونکے اندر داخل ہوئے اور اندر کی گھٹن اور بدبو کو باہر کا روزن ملا۔ سعدیہ نے پلٹ کر ملامت آمیز نگاہ سے سارے کمرے میں کو دیکھا پھر بیٹے سے مخاطب ہوئیں۔

''خضر چاند۔ کب تک یوں پڑے رہنا چاہتے ہو۔ دیکھو ذرا کمرے کی حالت۔''

مگر تیز میوزک کی آواز میں ان کی آواز چاند کے کانوں میں کیسے پہنچتی۔ وہ آگے بڑھیں اور سسٹم آف کر دیا۔ خضر نے ناگواری سے کہنیوں کے بل اٹھ کر دیکھا۔ ماں کو دیکھ کر بھی اس کی پیشانی کے بل تو نہ گئے لیکن تیور مدھم ضرور ہو گئے۔

''یہ کیا حشر کر رکھا ہے خضر۔ کمرے میں پیر رکھنے کو جی نہیں کرتا۔''

''تو نہ رکھیں ناں۔ کس نے بلایا ہے۔'' وہی خودسر اور پتھر پھاڑ لہجہ۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ سعدیہ نیچے کارپٹ سے اس کی کل رات کی اتاری قمیص اٹھاتے ہوئے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئیں۔

''کیوں نہ رکھوں۔ میرے چاند کا کمرا ہے۔ لیکن کچھ تو سمیٹ کر رکھا کرو۔ اب دیکھو ناں دیواروں پر کیسے فضول سے پوسٹر لگا رکھے ہیں۔ روزانہ ایک نئی تصویر کا اضافہ ہوا ہوتا ہے یہاں۔ گھر میں جوان بہن ہے بیٹا۔ زویا اسی لیے تمہارے کمرے میں نہیں آتی کہ ایک تو وہ کہتی ہے گندہ بہت ہوتا ہے دوسرے یہ واہیات سے پوسٹرز۔ اچھا تو نہیں لگتا ناں میری جان۔'' انہوں نے ہاتھ بڑھا کے اس کی پیشانی سے بال ہٹائے جسے اس نے نخوت سے جھٹک دیا لیکن سعدیہ کو فرق نہیں پڑا۔

''زویا کو تو بہانہ چاہیے امی۔ زین کی چمچی۔ مجھ ... میں تو عیب ہی دیکھتے ہیں سب کو۔ ہر کسی کو زین سے محبت ہے۔ وہ بھی اسی کے گن گاتی ہے۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر۔ میں اسی لیے تو یہاں سے دور چلا جانا چاہتا ہوں۔''

''میں کرتی ہوں ناں تم سے محبت۔ ساری دنیا سے زیادہ۔ اور ماں سے ہی دور ہونے کی بات کرتے ہو۔ ماں سے کیوں ناراض ہو۔ اب لڑ تو رہی ہوں تمہاری نوکری کے لیے سب سے۔ ابھی پھر ناشتے پر بدمزگی ہو گئی تھی۔ بیٹا زین کی نوکری پسند ہوتی ناں تمہیں تو وہی اس سے لے کر دلا دیتی لیکن تمہارا دماغ ہی بہت اونچا ہے۔ اپنی منوانے کے لیے پہلے تھوڑی سی ماننی پڑتی ہے چندا۔''

''کیوں..... کیوں مانوں میں کسی کی۔ اس لیے پیدا نہیں ہوا میں کہ غلامیاں کرتا پھروں۔ اور امی نوکری کی پروا کس کو ہے بھلا۔ آپ کو کہا تھا کہ آپ بات کریں ابو سے، زنیرہ پھپو کو میرے لیے منانے کی۔ وہ آپ کر نہیں رہیں۔''

اس کی آواز بلند ہو رہی تھی اور سعدیہ کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔ ایسے میں انہیں ہمیشہ کی وہی گھبراہٹ جیسے خضر کو کچھ ہو نہ جائے۔

''کی ہے..... کی ہے۔ حوصلہ رکھو۔ وہ ابھی نہیں مانے خضر۔ زنیرہ نے بات ہی زین کے لیے کی ہے تو وہ کیسے اپنی بہن کو تمہارے لیے قائل کر لیں۔ صبر سے کام لو۔ بار، بار کروں گی تو شاید بات بن جائے۔''

''میں نہیں کر رہا صبر۔ سمجھیں آپ۔'' وہ تن فن کرتا بیڈ سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ ''آپ کو دو دن دے رہا ہوں کچھ کر لیں ورنہ پھر میں کچھ کر لوں گا۔ زنیرہ پھپو کا داماد بنوں گا تو میں۔ کسی اور کو میں بننے نہیں دوں گا خاص طور پر اس زین چھچھوندر کو۔''

اس نے غصے سے واش روم کا رخ کیا تو پیچھے سے ماں نے آواز لگائی۔

''تو الگ سے کوشش کرو ناں۔ نینا سے رابطہ کرو۔ اس سے دوستی کرو۔ اسے قائل کر لو کسی طرح تو پھر تمہارے علاوہ پھپو کا داماد کوئی اور بن ہی نہیں سکے گا چندا۔''

سعدیہ کی بات سن کر وہ تھما۔ پلٹ کر ماں کو معنی خیزی سے دیکھا اور پھر متاثر ہوتے ہوئے اپنے دماغ کو شہادت کی انگلی سے بجا کر وہی انگلی ماں کی جانب لہرائی اور گنگناتا ہوا واش روم میں گھس گیا۔ سعدیہ فخریہ

www.dailyurdubooks.com
DAILY URDU BOOKS

بیٹے کو دیکھ کے مسکرائیں۔ ہمیشہ کی طرح وہ اولاد میں اونچ نیچ کا کھیل رچانے کے لیے کمر کسنے جا رہی تھیں۔

☆☆☆

زین اسٹاف روم میں داخل ہوا تو وہاں ایک نیا چہرہ دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس کی آمد کے ساتھ ہی سب نے اسے معمول کے مطابق پُرجوش سلام کیا کیونکہ وہ سبھی سے اچھی دوستی رکھتا تھا۔ اپنے ہاتھ میں تھامی چیزیں اس نے ایک جانب پڑی میز پر رکھیں اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ مسز وقار سینئر لیکچرار تھیں جن کی بغل میں وہ بیٹھی تھی۔ انہوں نے تعارف کروانے میں پہل کی۔

''سر زین، ان سے ملیے۔ یہ ہیں اسوہ خواجہ۔ نئی لیکچرار اپوائنٹ ہوئی ہیں۔ بہت ٹیلنٹڈ ہیں۔ آپ کی طرح چھوٹی سی عمر میں بڑے بڑے جھنڈے گاڑتے ہوئے یہاں تک کا سفر طے کیا ہے۔''

زین متانت سے مسکرایا اور مقابل بیٹھی اس سادہ سی لڑکی کو سر کے اشارے سے سلام کیا۔ جس کے جواب میں اس نے بھی سر ہی ہلا دیا۔ زین کی نگاہ چند پل اس کی نگاہ سے متصادم رہی پھر اس نے واپس ہاتھ میں تھامی کتاب پر نظریں گاڑ دیں۔ سادہ اجلا گندمی چہرہ، گالوں پر سرخی اور اس سرخی پر دکھائی دیتے مدھم سے پمپلز۔ درمیان سے مانگ نکالے آدھے سر کو دوپٹے سے ڈھانپے وہ بہت سوبر اور پُرکشش تھی۔ زین نے غور سے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں سبزی مائل سنہرا پن جھلکتا تھا۔ اور اب سے پہلے اس نے کبھی کسی کے چہرے پر پمپلز اتنے سجتے نہیں دیکھے تھے۔ زین ایک گہری نظر اس پر ڈالنے کے بعد ساتھ بیٹھے معاشیات کے پروفیسر ظہور احمد کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ دو گہری سبزی مائل سنہری آنکھوں نے اس کی بے دھیانی کے دوران پورے دھیان سے اسے دیکھا تھا۔

☆☆☆

رات دیر تک وہ لیپ ٹاپ پر بیٹھے رہنے کے بعد کمرے کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ باہر بہت پیاری ہوا چل رہی تھی۔ بھرپور انگڑائی لینے کے بعد وہ پنجوں کے بل دوبارا چک کر فریش ہوا اور لان کا رخ کیا۔ ہلکی، ہلکی خنک ہوا اور سبزے کی مخصوص خوشبو اس کی تھکن اتار گئی۔ دن بھر کی سخت روٹین میں اسے خود کے لیے وقت ذرا مشکل سے ملتا تھا۔ وہ پی ایچ ڈی کی تیاری شروع کرنے والا تھا اور اس سلسلے میں ایک بار پھر شدید مصروف ہو گیا تھا۔ وہ لان میں رکھی چیئرز میں سے ایک پر آ بیٹھا اور سر جھکا کر اپنے چپل میں مقید صاف ستھرے اور نفیس پیروں کو دیکھتے دن بھر کی روٹین ذہن میں دُہرانے لگا۔ ایسے میں سب سے پہلا جو چہرہ تصور میں ابھرا وہ اسوہ خواجہ کا تھا۔ ایسی سادہ لیکن بلا کی پُرکشش لڑکی ایک عرصے بعد نوٹس کی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ صنفِ مخالف کی جانب متوجہ نہیں ہوتا تھا۔ اسے اچھے چہرے، اچھے لگتے تھے۔ ایک خاص حد میں رہتے ہوئے وہ مناسب بات چیت بھی کرتا تھا لیکن اس نے کبھی کسی لڑکی سے دوستی نہیں کی تھی۔ شاید وہ گزشتہ کئی سالوں سے اس قدر مصروف ہو چکا تھا کہ اس جانب دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ کچھ کر دکھانے کا عزم اور جنون اسے دوسری باتوں کی جانب متوجہ ہونے ہی نہیں دیتا تھا۔ لیکن آج اسوہ خواجہ کا چہرہ اس کی توجہ مبذول کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب یہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا بس وہ اسے اچھی لگی تھی کہ دل چاہا اس سے بات کرے۔ اس کی آواز سنے۔ بس اور کچھ بھی نہیں۔ شاید!

وہ سوچوں میں گم مسکرا رہا تھا جب اس کے ساتھ والی کرسی پر زویا چائے کے دو بھرے ہوئے مگ لیے آ کر بیٹھی۔ وہ چونکا اور محبت سے بہن کو دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

''تم جاگ رہی ہو لڑکی۔ صبح کالج نہیں جانا کیا؟''

''آپ بھی تو جاگ رہے ہیں۔ آپ نے کالج نہیں جانا کیا؟'' زویا نے دوبدو سوال کیا تو وہ کھل کر ہنس دیا۔ زویا نے چائے کا مگ بھائی کی جانب بڑھاتے ہوئے اشتیاق آمیز لہجے میں کہا۔

''مجھے تو خوشی سے نیند نہیں آ رہی۔ آپ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے بھائی۔''

(ان شاء اللہ اختتامی حصہ اگلے ماہ)

www.dailyurdubooks.com
URDU BOOKS